

نکست
سینا اس جی

یا رب اس بار تو ہمیں ایسی عید دے
جو باہمی خوشی کی سب ہی کو نوید دے
جھگڑے، لڑائی اور سب بحران ہوں ختم
ہر لحظہ پاکستان کو خوشیوں کی نوید دے

مگر بہر حال وہ بہت حوصلے سے علم کے اس ذخیرے کو اپنے اندر سمونے کوشش کرتا تھا۔ اس کے ساتھ واش روم کا دروازہ تھا اور خن کے پاس ایک ٹیبل رکھی تھی جس کے اوپر بینک فیس کی سیڑھیاں پارٹی ڈول شیپ کا پین ہولڈر جس پر آپ کے بار چائیںس لود مار کر زور کھے تھے لیپ ٹاپ کیس، بائیک، چمندر پاؤں، ادھ کھایا ہوا Apple کا لوگو سب غصا رہتا تھا۔ اس کے آگے گھومنے والی کرسی رکھی تھی۔ اس کے بعد کمرے کے وسط میں آخری دیوار کے ساتھ بیڈ بچھا تھا۔ جس پر گلابی رنگ کی خوبصورت بیڈ شیٹ پکی تھی اور گہرے گلابی رنگ کا لفافہ دکھاتا تھا۔

اور اس مکمل ادبی ذوق رکھنے والے ذی نفس کے
کمرے میں اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ ایک عدد گھڑی تھی

اس نے بمشکل اپنی جلتی ہوئی متورم آنکھیں کھول کر کمرے پہ نگاہ دوڑائی۔ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پہ تھی اس کا کمرہ بڑا وسیع اور گنا نرؤ تھا ہمیشہ سے۔ دائیں جانب دیوار میں نصب لکڑی کی وارڈروپ اور اس کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل چمکتا دکھتا گا اس مرد جس کے آگے دنیا کے بہترین پرفیومرز کا ڈیزائن بڑے سلیقے سے سجا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ایک کونے میں سفید پھول جن کے پتے سبز تھے اور جن کی لمبی شبنمیاں کرسٹل کے شفاف گلدان میں بہت خوبصورت دکھائی دیتی تھیں دھرا تھا۔ اسی ٹیبل کے دوسرے کونے میں ایک نوٹو فریم تھا جس کے اندر ایک عورت کی تصویر تھی۔ اس فریم کے عین سامنے ہارٹ ٹیپ کے کئی پنکھ ٹکر کے جیلری ہاکس بہت خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ سامنے والی دیوار میں لکڑی کے مضبوط ٹکوں سے بنا ہوا ایک دھرا تھا جس کے کم و بیش دس گیارہ خانے تھے اس بک ریک میں انگریزی ادب کی Salviya plath تھا مس ہارڈی ڈکٹر ٹکسیپیئر مارلو کی کتابیں اور ادب میں راجہ گندھ آواز دوست زاویہ قطرہ قطرہ قلم آگ کا دریا آخری شب کے مسافر' الگھ ٹمری' شہاب نامہ اور انشاء نامہ کی کتابیں کزنٹ انیمرز سے متعلقہ عمران خان کی میں اور میرا پاکستان 'My feudal lord' بے نظیر کی سرگزشت سے لے کر دنیا کے ادب کے تمام بڑے بڑے نام ورائنڈ

”ہاں سلطان“ اس دنیا میں مصیبت کی مجسم صورت۔۔۔ اور اگر کوئی سادگی کا مقابلہ دیتا تو یقیناً اول انعام اسے ہی ملتا اور درویش صفتی کی آج کے دور میں اگر کوئی وقعت ہوتی تو اسے لازماً کسی تخت کی ملکہ بنایا جاتا۔ من درویش ہو تو زندگی سہل ہو جاتی ہے۔ دنیا کی چاہ ختم ہو جاتی ہے اور دنیا کی چاہ ختم ہو جائے تو راستے روشن اور تقدیریں مہربان ہو جاتی ہیں۔ مستزاد دنیا سے لگاؤ نہ ہونے کی بنا پر دین سے قربت بے پناہ تھی چلتے پھرتے درود شریف کا درویشوں پر جاری رہتا۔

ملک کے اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے سے ایلول کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں ایڈمیشن لیا تو ہاں جو اس کے انگلش اسپیکر کا کمال تھی کلاس میں ہمیشہ بیک بنکر ہی رہی وجہ ہمیشہ سے Introvert ہونا تھا۔ گھر میں ماحول خراب تھا۔ درگاہ کا ڈولاملا نہ کھل کر بات کرنے کی اجازت تھی نہ بے موقع محل قہقہے لگانے کی جیسی اس کی باتیں اور سہرا نہیں اندر ہی دم توڑ گئیں۔ ہمیشہ اول ہونے کی پٹا آنے کے باوجود غرور نام کا کینز ادا ملے میں نہ رینگ پایا۔

گھر ویل سلیڈ تھا۔۔۔۔۔ آرام سے ایلٹ کلاس میں شامل کیے جاتے تھے مگر ملکہ کی سیکھا ایسی تھی کہ مصنوعی پن کبھی نہ آنے پایا عادات میں اور پایا نے ہمیشہ ایک ہی تربیت رکھی۔

”لوگ کبھی خوبصورتی سے متاثر نہیں ہوتے ہمیشہ آپ کی گفتگو اور اخلاق انہیں بھاتا ہے۔ لوگوں کو اخلاق سے متاثر کر دینوں کہ ہمیشہ کے لیے ان کی یادداشت کا حصہ بن جاتے۔“

اور وہ صدا کی فرمانبرداران کی بات دل پہ نقش کر لی تھی اور ہمیشہ جب بولتی تو اگلے کو چپ کر دیتی۔ احترام بھرا بیٹھا لہجہ اور نرمی سے لبریز لفظ مقابل کو قید کر لیتے۔

وہ ہاں سلطان تھی اپنے پاپا کی سب سے بڑی بیٹی اور ان کا بازو! گریجویشن میں آئی تو انگریزی ادب اور نفسیات کو چنا۔ کالج میں نفسیات اردو میں پڑھائی جاتی

شاید اسے وقت دیکھنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی یا پھر شاید اس کے نزدیک وقت اتنا غیر اہم تھا کہ اس کی زندگی میں کسی کلاک کسی کیلنڈر کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اس نے لحاف سے چہرہ باہر نکال کر کھڑکی کو گھوما جہاں سے سورج کی ایک مدھم سی کرن بھاری پردوں میں سے رستہ بہتی ہوئی اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور یہ نفیسی سی کرن سیدھی اس کی آنکھوں میں پڑی تو اسے بے ساختہ درد کا احساس ہوا۔ اس نے دلیاں ہاتھ لحاف سے باہر نکال کر انگلی کی پود سے آنکھوں کو چھوا اور اسے پاتا یا کہ رات وہ لینز اتارے بغیر سو گئی تھی اور اب آنکھیں سنگ رہی تھیں۔ اس نے دوسرا ہاتھ مار کے لینز کی ڈیا سائیڈ ٹیبل سے ڈھونڈی اور اسی طرح لینے لینے لینز اتار کے ڈیبا میں موجود سلوٹن میں ڈال کے اسے سائیڈ ٹیبل پر پھینک دیا جہاں وہ پانی کی بوتل سے ٹکرا کر اٹنی گر گئی۔ اب اسے آنکھیں مسلتے ہوئے گردن پر کچھ جھپٹے کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ لگا کے کچر نکالا اور اسے بھی پھینک دیا۔ وہ آواز کے ساتھ ٹیبل سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔

اس نے لحاف اوپر کھینچا اور آنکھیں بند کر دیں۔ اس نے اس سارے عمل کے دوران یہ دیکھنے کی رحمت کی نہ کی تھی کہ دن کا کون سا پارہ ہے۔ مگر آنکھیں بند کر کے بھی دماغ وہیں رکا ہوا تھا۔ بالکل ویسے جیسے زندگی رک گئی تھی ٹھہر گئی تھی۔ اتنی ٹھہرے پانیوں جیسی زندگی سے لب لطفن اٹھنے لگا تھا۔

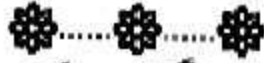
وہ جانتی تھی کوئی اسے جگانے نہیں آئے گا اور آج نومبر کی اس کبر و دھند سے لبریز صبح جبکہ سورج اپنی کمزور شعاعوں کو روئے زمین پر پھیلا نے کی کوشش میں سرگرداں تھا اس کا دل چاہا ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ اس کی آنکھیں بند ہی تھیں۔

کوئی شخص کسی کی زندگی یوں کیسے بہا کر سکتا ہے؟

اک تیرا جبر جو ہالوں میں سفیدی لایا!

اک تیرا عشق جو سینے میں جواں رہتا ہے!

اس کے لیے چائے بنانے چلی گئیں۔
اس گھر میں صرف چار لوگ رہتے تھے بابا بابا بابا اور
نضا۔ بس اور ساتھ جڑے گھر میں بچہ کی جیسی آباد تھی۔
جن کے بھی دو بچے ہی تھے حماد اور مومن۔



”آخر اس بات میں جھگڑا کرنے کی کیا ضرورت ہے
کہ دادا ابو ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا حماد لوگوں کے
ساتھ؟“ نضا جو کہ تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی اس نے اپنی عقل سمجھ
کے مطابق ڈرائنگ روم سے اٹھتی آوازوں پر بات کرتے
ہوئے بابا سے کہا جو کچن میں چائے کے لوازمات سیٹ
کر رہی تھی۔

”بات یہ نہیں ہے نضا۔“ اس نے سر جھٹک
”تو جھگڑا کیا بات ہے؟“ اس نے بھی بابا کے سے

انداز میں پوچھا۔
”اب نہیں کوئی ہوا ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔“ اس
نے دیکھ کر کہا۔ ”اب اس کی خام خیالی تھی کیونکہ اگلی
صبح اسے کالج سے واپسی پر نضا سے ہی پتا چلا تھا کہ دادا ابو
نے بچہ لوگوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا چہرہ
داواں دھواں ہو گیا۔ اسے اپنی دادو سے بہت پیار تھا اور ان
کا چچا لوگوں کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا کہ اسے ان سے
ملنے والے جانا پڑتا جو کہ اسے کسی صورت گوارا نہ تھا۔ مگر اب
کیا ہو سکتا تھا دادا ابو کو اپنی سچی (چچی) زیادہ عزیز تھیں اور
ان کے الگ ہونے کا مطلب تھا بزنس الگ ہونا۔
معاملات کافی سے زیادہ خراب نظر آ رہے تھے۔ بابا نے
ان کے فیصلے کو مجبوراً مان لیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے لڑ بھڑ کر
بھی وہ اپنی بات قطعی نہ منوا سکیں گے اور اب اس کے درواز
قد بند سم سے بابا۔۔۔ انہیں سب کچھ خود ہی سنبھالنا تھا۔
وہ خاندانی بزنس سے الگ ہوئے تو کئی دوست آگئے پانڈر
شب کی آفر لے کر انہوں نے کچھ دن سوپنے کے لیے
مانگے پھر بابا سے مشورہ کر کے ایک دوست کے ساتھ
پانڈر شب کر کے ایک نئی فیکٹری کا افتتاح کیا۔
شروع کے چند ماہ تو سب چھارہ کی خبریں آتی رہیں

تھی اس نے انگلش میں منتخب کی۔ وجہ بڑی واضح تھی
ملک کے اس اعلیٰ ترین تعلیمی ادارے میں پڑھنے والا بچہ
دنیا کی ہر زبان کو مشکل سمجھ سکتا ہے سوائے انگلش کے۔
وہ اس زمانے میں جب کہ بچیاں بچوں کے ماہنامے
پڑھا کرتی تھیں تو وہ ایلف کشف پاؤ لو چیلڈ ڈورس لسٹ
Enid Blynton اور Roal Dahl کو پڑھا کرتی
تھی مگر علم کا یہ بہتا خزینہ اس کے اندر ہی چھپا تھا۔ وہ
بیک بیچر ہونے کے باوجود اپنی نیچرز کی ورمل اسپون
غلطیاں نوٹ کرتی رہتی تھی۔

بابا نے کہا بھی کہ ”درو میں نفسیات پڑھ لو مشکل ہوگی
خود کیسے پڑھ سکوگی۔ جب کالج میں پراپر ٹیکچر دیئے
جا رہے ہیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ خواہ مخواہ میں اکیڈمی
رکھنے کا فائدہ؟

اس نے بہت ہموار آواز میں کہا تھا کہ اسے کسی اکیڈمی
کی ضرورت نہیں۔ وہ خود سے گھر میں ہی کور کر لے گی۔
گورنمنٹ اداروں کا تب حال یہ تو نہ تھا اب تو
انتظامیہ قدرے بہتری کی طرف مائل ہے مگر اس وقت تیار
نہیں تھا کلاسز بنک کرنے پر نہ تو کوئی پڑتا تھا اور نہ ہی
غیر حاضر ہونے پر ہر کلاس میں الگ سے جانچری لگتی تھی
کلاسز لینے کو دل کرتا لے لی جائیں باقی بچک۔ وہ
نفسیات کی کلاس لینے کی بجائے انگریزی میں اعلیٰ ادب
کی دنیا کی خاک چھانکتی رہتی اور دماغ کے کمرے ہوئے
خزانے میں ہرون سے مولیٰ و جواہرات کا اضافہ ہوتا رہتا۔
ملانے بھی فکر نہ کی کہ بیٹی کیا پڑھ رہی تھی۔ مذلت کب
آتا؟ بس پتا چل جاتا کہ اسے ٹیس کرینا گیا۔ ان کے لیے
بہن کافی ہوتا۔ بی اے میں بھی ہلکی فرسٹ ڈویژن آئی مگر
کمال تو اس نے انگلش لٹریچر اور نفسیات میں دکھایا تھا۔ اعلیٰ
نمبر لے کر پاس ہوئی تو بابا بھی بے انتہا خوش ہوئے تھے۔
اور اس کی بے انتہا خوبصورت کامنی اور چینی گڑیاں بابا
جو ہمیشہ اس کی فکر میں ہی گمن رہتیں کبھی اس کی
واڈ روپ سیٹ کرنے میں تو کبھی کچن میں مختلف ڈشز
بنانے میں۔ اب بھی وہ نہایت پیار سے اس کا ہاتھ چوم کر

پیدا کرتے ہوئے پورج کی روش پہ دھول اڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

دونوں گھروں کا گیٹ ایک ہی تھا جس کی وجہ سے مجبور آتے جاتے ایک دوسرے کی شکل دیکھنا پڑتی تھی۔

اور یہ تمام اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ اسے یاد آتا کبھی وہ دونوں ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جایا کرتا۔ ہاں ڈاکٹر!

ملیا سلطان کی سیدھی سادھی زندگی اتنی بھی سیدھی ٹیکری مانند نہ تھی۔ اس میں بہت سے نخل تھے۔ ریشم کے الجھے ہوئے دھماگے کی مانند۔



راؤ مزا جوں کا کیا عجب مقدر ہے
زندگی سے جس پچھنے والے لگانوں کو
راہ سے ہٹانے میں ایک ایک تنگلے سے
آشیاں بنانے میں خوشبوئیں پکڑنے میں
گستاخ ہونے میں عمر کاٹ دیتے ہیں!

اس نے میں بک پیٹینٹس لکھا اور ان ہا کس کھولا تھا۔
ہاں کئی میجر تھے اس نے کئی بار بعد فیس بک آن کی تھی۔
پتا نہیں کون کون اسے پیج کرتا رہا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ
اتھا کے گود میں رکھا اور ماؤس سکرول کرتے ہوئے اس
نے لسٹ کو دیکھا۔ ٹائپ کا پیج تھا جو کلاس فیلو تھی۔

"کہاں ہو ملہا؟ پیج دیکھو تو جواب ضرور دینا۔"
خاک کا پیج تھا!

"پاس ہونے کی اور ماسٹرز میں ایڈمیشن لینے کی
مدد کہلا سوری میں تھوڑا لیٹ ہوں۔" ساتھ ایک افسردہ سا
آلی کون تیسرا پیج حماد کا تھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر
گئی۔ اس نے پیج کھولا۔

"اگر خدا نے ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو اس میں
ہمارا کیا قصور ہے؟ انسان کو چاہیے کہ حسد کرنے کے
بجائے محنت کر کے خود کو اس قابل بنائے کہ دوسرے اس پہ
رفیق کریں۔"

اس کی رگیں تن گئیں۔ ذلت کی انتہا تھی اس کا دل چاہا

مگر پھر حالات کی چرخی اپنی چلتی شروع ہوگئی اور چند دن
بعد پایا لڑکھڑاتے قدموں سے گھرا گئے تھے۔

فیسٹری دیوالیہ ہوگئی تھی۔ مزدور تنخواہوں کا تقاضا
کر رہے تھے پانڈے نے خود ہاتھ اٹھا دیے تھے ہر چیز سے۔

لاکھوں کا نقصان ہوا تھا۔ قصور کس کا تھا؟ یہ فیصلہ کرنے کی
بجائے یہ مسئلہ زیادہ قابل غور تھا کہ گھر کے دروازے پہ

بیٹھے مزدوروں کو تنخواہیں کہاں سے دی جائیں۔ اس نے
اپنے پایا کو اتار پریشان کبھی نہ دیکھا تھا۔ پایا نے اگلی صبح
تنخواہیں دینے کا وعدہ کیا اور اس رات گھر کے گیراج میں
کھڑی گاڑی بک گئی۔

اور ساری زندگی کاروں پہ سفر کرنے والے پایا کو جب
موٹر ہائیک خریدنا پڑی تو وہ بے حد نوٹ گئے۔

اب زندگی بدل گئی تھی۔

وہ ملہا سلطان جو کبھی پایا کے ساتھ ٹھانڈ سے بڑی سی
گاڑی میں کالج جایا کرتی تھی اب جب ماسٹرز کا وقت آیا تو
خود ہی جا کر کالج میں انگریزی ادب میں اپنے فارم جمع کیا۔

آلی۔ انٹری ٹیسٹ میں دوسرے نمبر پہ نام تھا اس نے فیس
جمع کرائی اور کالج سے ٹائم ٹیبل نوٹ کر کے گھر آئی۔
کبھی کبھی وقت اور چیزیں اتنی تیزی سے بدلتی ہیں کہ

ہمیں سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملتا اور جب ہم دیکھتے ہیں تو
ہماری دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے بدل چکی ہوتی ہے۔

ملہا سلطان کی دنیا بدل گئی تھی۔ پیج پانڈے کا شکل گھر کا
خرچ نکل چل رہا تھا یہ امیر لوگ بھی جس عجیب ہی ہوتے

ہیں ان کے نزدیک یہ بھی غریبی ہی ہوتی ہے کہ گھر میں
چار کلو بجائے دو ڈسٹر چلیں۔

وہ کبھی بڑی شان سے پایا کے ساتھ کار میں کالج جایا
کرتی تھی اب اسی خاموشی سے واکنگ ڈسٹینس پہ ہونے

کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قابل اور بیگ پکڑتی اور باہر آ جاتی
جہاں اکثر اس کا سامنا حماد سے ہو جاتا جو یونیورسٹی جانے
کے لیے گاڑی نکال رہا ہوتا۔

اسے دیکھ کر ایک خاص نفرت کے اظہار کے طور
پر گاڑی کا دروازہ زور سے بند کرتا اور بائیں ایک کریب سٹارڈ

رک گئی تھی۔

وہ درمیانی دروازہ کھول کر ان کے پورشن میں جائے اور اس کا منہ توڑ دے۔ یہ صلہ تھا اس کی اتنی سادگی و معصومیت کا؟ اسے دونا آنے لگا۔

حماد اسلم سے اس کا مخاطبہ کا نہیں تھا۔ جب پیدا ہوا تو ماہانے اسے بے تحاشا پیار کیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوستی اور الفت مزید مضبوط ہوتی گئی۔ وہ دونوں اکٹھے گھوما کرتے پسند کی دھڑکن کھاتے اور مل کر ایک دوسرے سے اپنے مسائل و سسکس کیا کرتے تھے۔

حماد Relationship problem کا شکار تھا۔ وہ مسکن ادویات استعمال کرتا تھا۔ سارا بچپن اس نے اور حماد نے مل کر گزارا تھا۔ مومنہ اور فضا سائیڈ پارٹنر بنا کر رہتے تھے۔

ماہا کے اندر سارے شوق ہی انوکھے تھے۔ بچپن میں سارا دن سائیکل چلا پارتی، پینٹ شرٹ پہن کر گھومتی، کارڈز کھیلتی، ڈراما بڑی ہوتی تو بائیک چلانا سیکھ لی، کبھی کبھی وہ اپنے اندر موجود ان ساری خوبیوں سے گھبرا بھی جاتی تھی۔

حماد کے ساتھ باہر جاتے ہوئے بھی اس کی ایک ہی ڈیمانڈ ہوتی تھی۔ تیز رفتار گاڑی اور پان کھانا۔ حماد اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ مگر وہ کبھی اس سے اپنی ڈیمانڈ نہ کھاتا۔ ماہا نے بڑے ہونے کی بنا پر ہمیشہ ہی اسے وہاں کے رکھ رکھاؤ کے دوسرے اس کے اندر فطری صلاحیت تھی اس کی ٹیبلٹ کرنے کی..... وہ سب بچوں کو اپنے پریشر میں رکھا کرتی تھی۔

حماد کے ساتھ اس نے بہت سے حسین دن گزارے تھے مگر افسوس آج وہ بدل گیا تھا چننا سا حماد جو کبھی بہت دب کر رہتا تھا اب یوں تن کر گزرتا جیسے گردن میں سریاٹ ہو۔ اور اب اس کا یہ ان باکس میجنگ پڑھ کر اس کے کلیجے میں جیسے انکار سلوٹ گئے تھے اس نے غصے سے میجنگ ڈیلیٹ کر دیا۔ پھر چند لمحے خود کو ٹھنڈا کرنے میں صرف کیے پھر اس نے انکسٹیج دیکھا۔

”آغا شاہ زمان“

وہ چند لمحے بل نہیں سکی سکت ہو گئی تھی۔ اس کی ہیٹ

اس کی زندگی میں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک تھا ایک بڑا سا گھر اور میر کبیر و حیل..... مگر حقیقت ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ”ماہا سلطان“ واقعی دوسروں سے مختلف تھی۔ وہ کبھی جھوم کو فیس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ انگیزائی کی مریض تھی، پرجھوم سرکیں اور جگہیں اسے خوفزدہ کرتی تھیں۔ نفسیاتی زبان میں اسے Agoraphobia کہا جاتا ہے۔ اپنی اسی کمزوری کی بنا پر وہ کبھی تقریبات میں نہیں جایا کرتی تھی۔ گھر آئے مہمانوں کو ہینڈل کرنا ایک مسئلہ داخل ہو جاتا کرتا تھا اور دکھ کی بات یہ تھی کہ گھر والے اس کی اس نفسیاتی مرہ سے بالکل بے خبر تھے۔

دوسرا ادھکا اسے تب لگا جب فرسٹ ایئر میں اس کے دل سے زلزلے کا دینا شروع کیا۔ مرض بہت عجیب تھا اور کسی حد تک ایسا دینے والا بھی۔ انسان سیدھا سادہ دل کا مریض ہونا بات۔ اسے غصے میں آتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ کبھی گھبراہٹ اس کی ہیٹ کبھی یکدم تیز ہو جاتی تو کبھی بہت کم۔ چیک اپ ہوا میڈیکل ٹیسٹ ہوئے۔ ای سی سی جی ہوئی اس کی زندگی کا سب سے خوفناک تجربہ۔ وہ اندر ہی اندر بھڑکنی۔ ابھی عمر ہی کتنی تھی بھلا اس کی؟ صرف سترہ سال۔

کیسا حسین دن تھا عید کا اور کیسے برباد ہوا؟ اس کے اندر ماتم برپا ہو گیا تھا۔

ای سی سی جی کی رپورٹ سے جو بات سامنے آئی اس کی کڑیاں بھی پچھلے مرض سے جانتی تھیں۔ ڈاکٹر نے ماہا کو پاپا کو بٹھا کر کہا تھا۔

”ماہا Tachycardia کی مریض ہے اسے Arrhythmias بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں انسان کی دل کی دھڑکن کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ عرف عام میں اسے Beat missing بھی کہا جاتا ہے۔

جو بات اس کی بھی تقریباً وہی ہیں۔ High bp۔ سنگڑائی دہی ہوئی خواہشات و احساسات اپنی باتیں کسی

پورے خاندان میں نہ تھی اور شاید ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ ماہ سلطان جیسا منظر انسان بس ایک ہی ہوا کرتا ہے۔
 نہیں جب سے بھی دلچسپی تھی اسے اور اس کی پروا قائل اتنی شاعر اور اعلیٰ قسم کی تھی کہ بندہ نا چاہتے ہوئے بھی متاثر ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ سب سے پہلے تو اسیلے پر لگی ہوئی فیری میسڈوز کی تصویریاں کھنکھوں کو قید کر لیتی تھی اور دوسرے اس کے دیئے گئے اسٹیشن خوبصورت آیات و احادیث انگلیش کی کوئٹیشنز بہترین اشعار کا چناؤ۔ اس قدر احتیاط سے کیا گیا تھا کہ رشک آتا تھا۔ اس کی فریڈ لسٹ بھی مختصر تھی مگر سب ہی معزز اور معتبر لوگ تھے۔ ٹیلی میں سے کتنی بھی لیتے تھے۔

ماہ بھی خود بھی حیران ہوتی تھیں۔ وہ خود بھی ایک Sophisticated لیڈی تھیں مگر ماہ کا ذوق دعاوات بہت شاہانہ اور حکمت بھری تھیں۔ اس کا ہات لسنے والا مثال اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا اور دوسروں کے ساتھ بات چیت اس قدر شاہی انداز تھا کہ پچھونے ایک دن بے ساختہ کہا تھا۔

You are a very official maah!

"بھائی جان آپ اسے سی ایس ایس ایس کروائیں۔"
 انہوں نے خلاصانہ انداز میں کہا تو ماہ نے بہت چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

جبکہ پاپا کے چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اپنی ذہین بیٹی پاپا نہیں بہت ناز تھا۔ جس نے کسی بھی قسم کے حالات میں ان پر بوجھ نہیں ڈالا تھا بلکہ انہیں تو خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور اس کا رزلٹ ان کے ہاتھ میں آتا تھا۔ اب بھی اپنی بہن کی بات سن کر انہوں نے مسکرا کر ماہ کو دیکھا تھا۔

"کیوں ماہ؟ آپ کیا کہتے ہو بیٹا؟" ان کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ اس نے پاپا کو دیکھا اور سوچا کہ کتنے زمانوں بعد پاپا یوں مسکرائے تھے۔

"آف کورس پاپا۔۔۔ آئی کیمن ڈوائس۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

سے شیر نہ کر سکتا بہت ہی خود بین شخصیت ہونا یہ سب اس کی وجوہات میں شامل ہیں۔ آپ مایوس مت ہوں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی کچھ میڈیسنز لکھ کر دے رہا ہوں مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک بات یاد رکھیں اس مرض میں جتنا انسان کو اگر کوئی چیز جلد از جلد ٹھیک ہونے پر مجبور کر سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف دوسروں کا پیار تو جذبہ خیال اور شیرنگ ہے۔ اس بیٹی کو بالکل تنہا مت چھوڑیں۔ اسے گھر میں بڑی رکھیں جتنا ہو سکے اس کو کہنی دیں اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں شیر کریں اس کی رائے لیں کیونکہ ماہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تنہا کمتر اور کمزور محسوس کرتی ہے۔ یہ سب اس وجہ سے ہے یاد رکھیں کہ ڈاکٹر ہر مرض میں یہ تجویز دیتا ہے کہ مریض کی اپنی دل پاور بہت کاؤنٹ کرتی ہے مگر میرا ذہنی خیال ہے اس مرض میں ایسا قطعاً نہیں ہو سکتا اس لیے جہاں تک ہو سکے اس کا خیال رکھیں اور اگر آپ اسے صحت مند نارمل انسان کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو مکمل طور پر میری ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ انہوں نے تفصیلاً جواب دیا تھا۔

ماہ پاپا ڈے رنگوں کے ساتھ کہتے رہ گئے۔
 وہ اسے گھر لے آئے اور اس کے بعد اس کے سائیڈ میبل کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے۔
 ہو کر رہ گیا۔

زندگی افسانوی ہیروئن کی مانند آسان نہیں تھی۔

ماسٹرز کے ایگزٹریوٹ کے بعد وہ فارغ ہوئی تھی جہیں کتابوں میں خود کو مصروف رکھتی یا پھر نیٹ۔

نیٹ اس کا شوق تھا۔ نت نئی موبویز دیکھنا ترکی ریشین اور انگلیش موبویز اس کا شوق تھا یا پھر دھیمے سروں میں نمائند علی اور نصرت فتح علی خان کی غزلیں سننا۔۔۔!

غالب اقبال اعتبار ساجد فیض امجد اسلام امجد اور فرحت عباس شاہ کی شاعری سے اسے عشق تھا۔

اس جیسا مکمل ادبی ذوق رکھنے والی ہستی ان کے

احادیث آیات خوبصورت کوشش اشعار چٹاؤ یہاں
بھی کمال تھا اتنی ہمت اتنی کجائیت اور اتنی ہم خیالی۔ وہ
جوں جوں بڑھ رہی تھی ٹھنک رہی تھی۔ کوئی چیز دھیرے
دھیرے دل میں گھیرا ڈال رہی تھی۔ کوئی طلسم ہو رہا تھا کتنا
عجیب سا احساس تھا نایا تناسب کچھ ایک جیسا کیسے ہو سکتا
ہے؟ وہ حیران تھی۔

اس کے اندر ایک انوکھا احساس جنم لے لگا۔
اس کے ہاتھ تیزی سے کی بورڈ پہ چل رہے تھے۔ وہ
جواب لکھ رہی تھی۔

ہاں یہ غارتھا اس کہانی کا۔ جس کا انجام کسی کو معلوم
نہ تھا شاید ہر کہانی کا انجام یوں ہی انجام ہوتا ہے۔

اور یوں ماما سلطان اٹھنا شاہ زمان کی کہانی کا آغاز
ہو گیا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں مگر پھلکی گپ شب دوستی
اشیئیں اس کے دل میں بھرا کوئی کمنٹ اور پھر ان بائس کی
باری آئی وہ بہت سی باتیں دوق کے حامل تھے صبح بخیر کہنے کا
انداز اس کی ہر بات میں خوبصورت تھا کہ اگلا بندہ حذر وہ
نہیں کرتا۔ اکثر اسے پھلوں کی خوبصورت تصاویر ہی
بھیجتا کرتے اور پھر شعر و شاعری کا تبادلہ ہونے لگا۔ یہاں
مقامی مقابلے ٹکرا کر کاٹا ان دنوں کا ذوق ہی بہترین تھا۔
ایک دن اس نے چند اشعار پڑھے تو بہت دیر گم صم
رہی تھی۔

وہ جو اس کے بنا گزاری ہے
زندگی تھی عذاب سے بڑھ کر
دل کے شیشے میں اور کیا ہوگا
اس مہتاب سے بڑھ کر
اس نے بنا سوچے سمجھے نہیں بھیج دیئے۔

اور اس سے جواب مل بھی گیا۔

”ماما سلطان“ کے لیے۔

گھر پہ کس طرح ممکن ہے

کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو

تو اس کی دیوار جاں نہ فونے

وہ اپنی ہستی نہ کھول جائے!

”آئی نو بیٹا“ آپ کر سکتی ہو مگر یہاں بات آپ کی
چو اس کی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے نرمی سے معاملہ اس
پر چھوڑ دیا۔

اس نے مسکرا کر کہا: ”جو کہ پھپھو کے ساتھ جنسی تھیں۔“

”اب میری بھی یہی چو اس ہے پایا۔“ اس نے پر عزم

طریقے سے کہا۔

اور یوں ماما سلطان کی زندگی میں ایک خواہش ارادہ اور

عزم داخل ہو گیا تھا۔ جس نے اس کی پوری زندگی کا اس

نیل کی طرح جکڑ لیا تھا۔



اس نے ”آغا شاہ زمان“ کا نام دوبار پڑھا۔ وہ بار
پڑھا اور پھر سچ کھول لیا۔

”اتنے دن کی غیر حاضری ٹھیک نہیں ہوتی“ بندے کو

فکر ہو رہی تھی ایک بلینک فیکٹ ہی کرو یا کریں جس

سے خیریت پتا چل جائے۔“ اس نے میٹج پڑھا مگر نظریں

بہت دیر تک ان دو سطروں پر ٹکی رہیں۔ دنیا میں ایسا کوئی تھا

جسے اس کے ہونے یا نہ ہونے سے فرق پڑتا تھا؟ جسے اس

کی خیریت سے غرض تھی؟ اسے لگا اس کا دل رک رک کر

چل رہا ہے۔ پھر اس کی انگلیاں دیکھ گئی انداز میں کی بورڈ پر

چلنے لگیں اور آغا شاہ زمان کے متعلق سب کچھ لکھ پایا گیا۔

اس کی نظریں مسکریں پہ بھٹکتی لگیں۔

”آغا شاہ زمان۔“

”سی ایس پی آفیسر ایٹ سول سکلرٹ گریڈ 18“

رہائش اکوئٹ۔

اس کی آنکھیں چند لمحوں کی پھر اس نے پروفا کی کچر

کھول لی اور آنکھوں میں جیسے چاندنی سی اتر آئی تھی۔

آوی تھا کتا فٹ! دراز قامت، سرخ و سفید چمکتا ہوا رنگ

گہری بھوری آنکھیں اور گلابی ہونٹ! وہ چند لمحوں

ہی نہ کی پہلی نظر کا وار بہت قائل تھا۔

اس نے بمشکل نظر ہٹا کر اس کی Line Time

کھول لی تھی۔

اور اگلے ہی لمحے پھر چونک پڑی۔

اس دن بہت دیر تک وہ دونوں میچ پہ بات کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی باتیں پسند ناپسند کی باتیں کتابوں کے حوالے اور شاعری کے ٹکڑے سب کچھ ساتھ ساتھ بہت خوبصورتی سے چلتا رہا۔

اور اس مدت جب وہ سوئی تو اس کی آنکھوں نے بہت سے حسین لفظ پھولوں کی صورت اپنے گرد جگمگاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

اور وہ نیلے کو بچنے بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتی رہی تھی۔ پتہ نہیں اتنے سارے خواب کہاں سے آنکھوں میں آنے لگے تھے وہ خود بے خبر تھی۔ اور انکی میچ وہ ای میل اس کے ملنے کی ڈی پی آئی جس نے اس کی پوری زندگی کا رخ مڑا دیا تھا۔

پتہ نہیں کہاں کیوں لگتا ہے جیسے روح میں کوئی خالی پن تھا سب کچھ میسر ہونے کے باوجود بھی ایک کی سی تھی شاید یہ خلا آپ جیسی کسی ہستی کے نایاب ہونے کی بنا پہ تھا۔ اور آج میں لگ رہا ہے جیسے خالی پن بھر گیا ہو آپ بہت خاص ہیں ماما بہت نایاب اور بہت پیاری..... جب سے آپ ملی ہیں اپنا آپ مکمل محسوس کرتا ہوں آپ سے رابطے کی تسکین چاہتا ہوں مایوس مت کیجیے گا۔ لفظ تھے یادھا کہ اختتام پاک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کیا اور سر نیچل پڑھ دیا اس دن وہ سارا وقت دھڑلہ دھڑلہ بولائی سی پھر ملی رہی ماما کو جتن میں کام کرتے دیکھ کر بھی اس نے کوئی مدد نہ کی۔ لفظ اس سے انگشت کا کچھ پوچھنے آئی تو اس نے سر دھکا کا کہہ کر نال دیا۔ عجیب سی بے معنویت ہر چیز پہ حاوی تھی۔ وہ یہیں جیسے کسی دوا ہے پتا نہ کر سک گئی تھی۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا وہ عجیب سی بے بسی سے بار بار کمپیوٹر پہ ہاتھ رکھتی پھر اٹھ جاتی آن کرنے کا دل ہی نہ کر رہا تھا۔

کتنی ہی کتابیں کھولیں پڑھنے کے لیے مگر وہیں نہ لگ سکا اس نے دوبارہ سے بکریک میں دکھنا چاہیں تو ساری ترتیب بگڑ گئی۔ میچ کرنے بیٹھی تو عجیب سادہ بھر آیا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر وہیں بیٹھ کر رہنے لگی۔ زندگی کس

وہ چند لمحے ششدری میں بھی رہی پھر اس نے لکھا۔

"تھینک یو سوچ سر۔"

"سر مت کہا کریں۔"

"کیوں؟"

"نام ہے میرا۔"

"مجھے پتا ہے۔"

"تو وہ کیوں نہیں لیتیں۔"

"اچھا نہیں لگتا مجھے۔"

"لیکن آپ میری ماتحت تو نہیں ہیں نا؟"

"جی مجھے پتا ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر کیا؟"

"ہم کیا ہیں؟"

"دوست" اس ایک لفظ نے فضا میں روشنی سی بکھیری تھی پتا ہے لگا ہر چیز منبری کی ہو گئی ہو۔

"پچھلے کس فاروس آئے۔"

"نیا رو ملے۔" اس نے مسکرا کر لکھا۔ جواب اس کے ہاتھوں کے ساتھ جواب بھیجا گیا۔

"بہت پیاری دوست ماما کے لیے۔"

اور وہ بہت دیر تک "یارو دوست ماما" نظر میں جمائے رکھتی رہی تھی۔ بہت کچھ بدل گیا تھا اور بدل رہا تھا۔

.....

پیا سوں کے گرد صراب

معذوروں کے آگے دیواریں

اور تاریناؤں کے راستوں میں

کیل بونے والے

شاید اپنے اپنے گریبان کہیں گم کر بیٹھے ہیں!!

ایک سرکاری افسر کا اس قدر کڑا جتن کر "ماما سلطان"

تو جیسے تھوٹ میں اس کی غلام بن گئی تھی اس نے بے ساختہ

تعریف کی گئی۔

"آپ کا انتخاب بہت خوبصورت ہے سر۔"

"تھینک یو ماما۔" انہوں نے کہا۔

”کیا کیا آج سارا دن؟“ وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں ایسی دہائی تھی۔
”میں تو بہت مصروف تھا۔“ انہوں نے بتا پوچھے ہی اپنا بتایا۔

”آپ تو پھر افسر ہیں نا؟“ وہ ہلکے سے مسکرائی۔
وہ اس کے ”افسر“ کہنے پر ہنس دیئے تھے۔
”نہے جناب..... کہیں کے افسر؟ ہم تو خلیفہ ہیں سرکار کے۔“ انہوں نے بڑے لٹشیں انداز میں تشریح کی تھی۔
وہ بہت محفوظ ہوئی تھی۔ دمنٹ کی مختصر گفتگو کے بعد کال اینڈ ہو گئی۔



کوئی دھکا سونپ دینے لگا۔
یہ کیا تھوڑا سوچا اور سوچنے ہی رہتا!
اس کے پایا کے ساتھ جا کر اردو ادب کی نثر اور شاعری کی بہت سی کتابیں خریدیں۔ اور نئے سرے سے ان کا مطالعہ کیا۔
وہ کئی مباحثوں سے دور بھاگنے والی تھی تو اب اس کی نگرانیوں میں مقابل سے کسی طور پر بھی کم بڑنا نہیں تھا۔ بلکہ پہلی بات چیت اب قدرے بے تکلفی میں ڈھلتی محسوس ہو رہی تھی۔ بات کا انداز بھی بدل رہا تھا۔
اور یہ وہی دن تھے جب آسمان بہت کھلا کھلا نیلا محسوس ہوتا ہے..... رنگ ہر سو پھیلتے محسوس ہوتے تھے۔
پھولوں کی خوشبو کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ فضا میں خوشبوؤں کا رقص جاگا اور جب صبح کی ٹھنڈی ہوا چلتی تو دل چاہتا کہ وہ بھی تلی بن کر ان بادلوں کے ہمراہ اڑتی چلی جائے۔ اور جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو جاتے تو وہ کتنی دیر کھڑکی پر بیٹھی پنو نیا کے پھولوں کو دیکھتی رہتی اور سوچتی کہ دنیا کس قدر خوبصورت اور وہ کس قدر بے خبر!

اسے بے وقت اور بے بات ہنس آتی رہتی..... وہ کھٹکھٹاتی تو ماما بڑی حیرت سے اسے دیکھتی تھیں۔ انہوں نے کبھی ماما کو اتنا ہنسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ صبح ان کے جاگنے سے پہلے ہی ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی اور اکثر رات بارہ

عجیب موڑ لائی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی کے پار دیکھا جہاں رات پچھیل چکی تھی اس نے اٹھ کر کمپیوٹر آن کیا۔ ان کا بیج موجود تھا۔

”آپ نے اسی میل دیکھ کر بھی جواب نہیں دیا؟ تو کیا میں خود کو نامراد سمجھ لوں؟“

وہ ساکت رہ گئی۔ پھر کمپیوٹر بند کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اسے شخص کا احساس ہونے لگا۔ وہ اٹھی شامل اٹھائی اور باہر نکل آئی اس کا رخ چھت کی طرف تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور چھت پر آ گئی۔ فضا میں ٹھنڈک کا رچاؤ تھا یہ جاتے تو ممبر کی رات تھی۔ پام کے طویل درخت ساکت تھے اور ان کی شاخوں پر دھند بھرا کیسے ہوئے تھے۔ وہ بہت دیر تک چھت پر بیٹھی رہی پھر تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیکھا اور پھر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اس کی انگلیوں میں خفیف سی لرزش تھی۔ اس نے نمبر ڈائل کر کے فون کان سے لگا لیا تیل جاری تھی اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چوکی تیل پہ فون اٹھا لیا گیا۔
”ہیلو.....“ ایک گھمبیر اور کسی قدر مفرد سی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

اس کا سانس اور بھی تیز ہو گیا۔
”سر.....“ وہ بدقت واز نکال کر بولی۔

”ماہ.....!“ وہ فوراً پہچان گیا تھا۔ چند لمحے تو حیران ہی رہا پھر بے ساختہ ہنس پڑا۔ کھٹکھٹاتے سکے کی مانند شفاف انسی وہ سانس روکے سستی رہی کیا کسی کی انسی اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتی ہے؟ اسے دھتکتا نے لگا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔
”تھینک یو سوچی ماہ!“ انہوں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے شکریہ ادا کیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی۔

”آپ کیسے ہیں؟“
”میں بالکل ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟“ لہجے کا احترام اسے قید کر گیا تھا۔ بمشکل وہ بول پائی تھی۔
”میں بھی ٹھیک ہوں۔“

خاموش رہ گئی۔ اسے بتا تھا کہ کوئی نہ صرف ان کی پوسٹنگ ہوئی تھی درنشان کا آبائی گھر گاؤں میں تھا۔
”آپ بات نہیں کریں گے وہاں جا کر؟“ اس نے اداسی سے پوچھا تھا۔

”کیوں نہیں بالکل کروں گا۔“ انہوں نے مستحکم انداز میں کہا۔

”لیکن اتنی دیر بات کرنا ممکن نہیں ہوگا.....“ وہ اسے جیسے ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔

”جی ہاں تو مجھے اندازہ ہے۔“ اس کا لہجہ دھیمہ مگر پرسوز تھا۔ وہ محسوس کر گئے۔

”اما..... جان ایسے نہیں کروڑوں میں جا نہیں پاؤں گا۔“ وہ بے بسی ہو گئے۔

”ارے نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔“ وہ خود کو سنبھال کر بول رہا تھا کہ بات بدل دی تھی۔

”ابھی آپ نے کچھ کچھ لکھا ہے کہ وہ بہت پیاری ہے“ اظہارِ محبت سے بول رہا تھا۔ ”اسے یاد آیا تو کہنے لگی۔ وہ چار

پانچ سال کا بت پیدا ہوا تھا۔ جیسی وہ بولی تھی۔

”اس..... میرا بیٹا ہے۔“ وہ فیس کر رہا تھا۔

”جی ہاں۔“ اس نے بے یقینی سے دہرایا تھا۔ اس کے

چہرے تلے سے زمین نکلی تھی۔ وہ حواس باختہ سی ہو کر ادائیگی آواز میں کہنے لگی۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ..... آغا مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔“ اس کا دل شاید دکنے لگا تھا۔

”اما..... جان اپنے بیٹے کی بات کر رہا ہوں میں۔“ وہ اس بار قدرے پرسکون ہو کر ریٹھ گئے تھے جبکہ اس سے پہلے ہینگیٹ میں مصروف تھے۔

وہ لحظہ بھر میں جیسے گولی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا رہی تھی اور دم گھٹ رہا تھا۔ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ اسے پکار رہے تھے مگر وہ سننے سے قاصر تھی۔ اس نے بمشکل ٹیبل کے کونے کو تھام کر اپنا توازن برقرار رکھا اور پھر ایک لمبا سانس لے کر تیز ہوئی دھڑکن کو

”اما! جان..... تڑپا دیا ہے مجھے..... ہم واپس اتنی پیاری ہو یا مجھے لگی ہو کب ملوگی؟“ آواز میں اتنی تڑپ تھی کہ وہ لرز گئی۔ کچھ بولا ہی نہ گیا بس چپ رہی۔

”اما! میری زندگی..... کچھ تو بولو.....“ وہ بے صبری سے بول رہے تھے۔

”کیا بولو؟“ وہ بدقت آواز نکال پائی تھی۔ اور وہ رات بہت خاص تھی۔ آغا نے اسے بہت سے پیارے

پیارے جملے کہے تھے۔ اسے گا کر سوچنا سنا تھا۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیل آتا ہے کہ جیسے تجھ کو بتایا گیا ہے میرے لیے

تو اب سے پہلے ساروں پہ بس رہی تھی کہیں تجھے زمیں پہ بلایا گیا ہے میرے لیے.....!!

اور اس سے برعکس وہاں ہمارے بے ساختہ محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرائی تو وہ قربان ہوئے تھے۔ ان کا بس

چلتا تو اسی وقت آتے اور اسے اٹھا کر لے جاتے۔ وہ ہاتھ بے تاب تھے کہ اما کو خود پر شک آئے گا تھا۔

کوئی کسی سے اتنی محبت کیسے کر سکتا ہے؟ اسے حیرت ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ منزل تک آگئی ہو۔ وہ آغا ہی تو تھے جن کے لیے اس نے خود کو سنبھال کر

رکھا تھا اس کو لگتا تھا زندگی میں سب کچھ مکمل ہو گیا ہو۔ ایک بظریب بہاؤ تھا جس میں وہ دوڑوں جتے جا رہے تھے۔ ہر روز وہ آفس جانے سے پہلے اس سے بات کر کے

جاتے تھے۔ اسے آفس جا کر اپنی ہر روز کی تصویر بھیجتے تھے پھر میسجنگ سارا دن چلتی رہتے مگر وہ کی چھوٹی چھوٹی باتیں

ان دونوں کو اتنی دلکش کبھی نہ لگی تھی۔ جتنی اب لگتی تھی ہر چیز خوشنما ہو گئی تھی۔ اس نے سیل فون میں ان کے نام کے

آگے ”آغا“ لکھ کر ان کی شاندار سی تصویر لگائی تھی اور جب بھی ان کا میسج آتا ساتھ ان کی چمکتی ہوئی تصویر آتی تو اس کا

دل بخور قفس ہو جاتا۔ مگر یہ سب زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا۔

آج صبح ہی تو وہ دونوں بات کر رہے تھے جب انہوں نے اسے بتایا کہ وہ کل شام گھر جا رہے ہیں تو وہ چند لمحے

اس نے مردوں کی طرح رات گزاری تھی۔ اگلی صبح ان کا فون آیا تو وہ کتنی ہی دیر ان کی چمکتی تصویر کو دیکھتی رہی کس قدر خوبصورت اور مکمل وجود تھا ان کا مگر اس نے اپنا آپ تباہ کر لیا تھا اس نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ماہا.....“ وہ ہڑپ کر بول رہے تھے۔
”جی.....“ اس کی جی سسکیوں میں ڈوبی تھی۔
وہ خاموش رہ گئے۔ وہ روٹی رہی وہ کتنا ضبط کرتے آخر کار بول پڑے۔

”بس کرو ماہا۔“
”میں ٹھیک نہیں ہوں۔ مجھ سے بات نہیں ہو سکے گی۔“ وہ بچوں کے بیچ بھٹک بول پانی تھی۔

”میں نہیں بتا رہا تھا مگر نہیں بتا سکا میں تمہیں تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔“ وہ چپکے سے کہہ رہے تھے۔

”مرد بھی مجبور نہیں ہوتا آغا! مجبوری تو عورت کا زیور ہے ہمارا معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں آج بھی مرد کا تسلط ہے۔ تو بس محکوم ہے۔“ وہ دل سوزی سے بول رہی تھی۔

”مجھے معاشرے میں مرد و عورت کے کردار پہ تم سے بحث نہیں کرنی ماہا میرے نزدیک اہم یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”یہ غلط ہے آغا! بالکل غلط۔“ اس نے رد کیا۔
”کیا غلط ہے ماہا..... میرا تم سے محبت کرنا؟“ وہ شاکڈ رہ گئے۔

”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔
”وہ کیسے؟ محبت پہ پابندی نہیں لگا سکتا کوئی۔“ وہ جتا رہے تھے۔

”ہمارا معاشرہ کسی بھی شادی شدہ مرد کو ایسی محبتیں کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔“ وہ جیسے انگڑوں پہ لوٹ رہی تھی۔

”معاشرہ اور اجازت؟ مائی فٹ۔ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں یہ میں خود طے کروں گا معاشرہ نہیں۔“ انہوں نے دونوں لہجہ میں کہا۔

تھا مٹا چاہا مگر بے سود رہا تھا وہ لڑکھڑا کر گری اور اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو ماہا اس کے پاس تھیں۔ اور اس نے اسباب کھف کی طرح خود کو محسوس کیا جو نیند میں تھے اور باہر دنیا کا سکہ بدل گیا۔ ماہا سلطان غفلت کی نیند سوتی رہ گئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس نے فون دیکھا تو ان کے پیچ موجود تھے وہ اس کی غیر موجودگی کو لے کر پریشان تھے اور بے بسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ کال کرنا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ان کے پیچ کا جواب نہیں دے رہی۔

وہ رات بہت کرب ناک تھی اس کی بیٹ سخت تیز تھی اس نے کتنی دوائیاں کھالیں مگر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ کس کو بتاتی؟ کس کے گلے لگ کر روٹی؟ اسے اس قدر بے بسی ہو رہی تھی کہ دل چاہ رہا تھا کہ وہ چھٹی چاتی اس کے شہر جائے اور اس کے در پہ چمٹ جائے اس سے پوچھے کہ اسے آخر کس گناہ کی سزا دی گئی؟ کیوں اسے بے خبر رکھا؟ کیوں؟ وہ روٹی رہی اور قطرہ قطرہ آنسوؤں سے اس کا رخ بھیگتا رہا۔ اس نے بھی نہیں سوچا تھا کہ آغا شاکڈ اس کے ہوں گے اسے حیرت مٹی ناقابل یقین کی بات مٹی کی انہوں نے آخر اس سے اتنی بڑی بات کیوں کہہ دی اور کیا وہ اس سے محبت کا ڈھونگ کرتے رہے؟ کھانا کھائے؟ اس کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ انہوں نے کس بات کا بدلہ لیا تھا اس سے؟ آخر کیوں کیا تھا انہوں نے ایسا؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی کڑھ رہی تھی اور جتنا کڑھ رہی تھی اس سے زیادہ رو رہی تھی۔ وہ کس قدر پاگل تھی۔ اسے بھی اندازہ ہی نہ ہوا تھا آخر کیا بگاڑا تھا اس نے آغا کا؟ کس بات کی سزا دی گئی انہوں نے اسے؟

وہ ساری رات بن پانی کے مچھلی کی طرح تڑپتی رہی۔ زندگی خاک ہو گئی تھی۔

.....

لوگ عشق کو ذوال کہتے ہیں
میں اس ذوال کے عروج پہ ہوں

کاشی، سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش میں نڈھال ہوئی
جاتی اور تکیا نگوں سے بھینکا رہتا۔

ادھر ان کے ستم اتنے
کہ جن کی حد نہیں کوئی
ادھر بھی طرف والے ہیں
شکایت تک نہیں کرتے

اسے آج تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ آغا کی طبیعت گھر
جا کر اتنی خراب کیوں ہو جاتی ہے۔ اکثر انہیں سر درد
ہوتا..... ورنہ چیٹس ایکشن..... وہ پریشان ہوتی انہیں
کتنی ہی دوائیوں کے نام بتاتی اور وہ ہنس کر کہتے۔ "ٹھیک
ہے ڈاکٹر صاحب! لے لوں گا۔" وہ ان کی مصنوعی ہنسی سن کر
روئے لگتی تو انہیں چپ لک جاتی۔

"آپ ٹھیک نہیں لگتی آغا..... یہ اتنا سر درد
آخر کیوں ہے آپ کو آپ کسی نئے دوا سرجن کو چیک اپ
کرائیں نہ؟" وہ ان سے الجھ پڑتی۔

"ہاں جی! آپ داخل آؤں گا تب کرا لوں گا۔" وہ تسلی
کرتے ہوئے چل دیتے۔

اما کو اندر نہیں یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے
ساتھ خوش نہیں تھے۔ آخر کیا کلیش تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی مگر
اسے جاننے میں دلچسپی تھی دوسری طرف جب بھی اس نے
آغا سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی وہ خاموشی اختیار
کر لیتے۔ وہ دوبارہ بات کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتی.....
اور ہار کر موضوع بدل دیتی۔ وہ واپس آتے تو ہانکل ٹھیک
ہوتے وہ حیران ہی ہوتی رہتی۔

اور پھر دوسرا یا لوگوں کو جدا کرنے والا مہینہ ان دونوں کو
محبت و الفت کے ایک انٹو رشتے میں باندھ گیا۔ وہ
چھٹیوں میں گھر نہیں گئے تھے سارا دن وہ اس سے بات
کرتے رہے اور اما تو جیسے ہوائوں میں تھی اس کے سب
گھر والے لاہور شادی پر گئے تھے اور ہمیشہ کی طرح اما
نہیں گئی وہ گھر پر ہی تھی اور چونکہ ساتھ ہی چچا لوگوں کا
پورشن تھا اور دادا اب بھی چکر لگاتے تھے اور وہ بھی تنہا تھی سو
دونوں نے دل بھر کر سارا سارا دن بات کی۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" انہوں نے پوچھ لیا۔

"آپ کو اتنی سی بات سمجھ نہیں آتی؟ کیوں خود کو دھوکہ
دے رہے ہیں آغا؟" وہ جگ پڑی تھی۔

"میں کوئی دھوکہ نہیں کر رہا ہوں۔" وہ بارہ
یہ بات مت کرنا۔" وہ بھڑک اٹھا ان کی آواز بلند تھی۔

اما بے ساختہ سہم گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ رونے لگی اور غصہ پڑ گئی۔

"محبت پڑ رہی نہیں ہے اما جان..... تم سے بہت پیار

کرتا ہوں بے حد بہت شدت سے چاہا ہے میں نے

تمہیں۔ نہیں وہ سکتا میں تمہارے بغیر۔ میں تمہیں کبھی

نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ بوجھل اور محبت سے لہریز لہجے میں کہہ

رہے تھے اور اما..... آخر کار ایک لڑکی تھی سر تاجران کی

محبت میں غرق وہ ان کی پہنائی ہوئی چیزوں میں بخوشی

جکڑتی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔

زندگی میں بہت سے مقامات پر ہمیں احساس نہیں

ہوتا کہ ہم اپنی وقتی اور عارضی خوشی کے لیے اپنے آپ کو

ایک گڑھے میں گرا لیتے ہیں اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ

ایک غلط انتخاب کیا قدم نہیں کس مقام پر لے جاتا ہے۔

اما سلطان بھی بے خبر تھی کہ اس کا انتخاب کیا قدم اس

کی زندگی کو کس گڑھے میں لے جائے گا؟

اس نے سمجھوتہ کر لیا۔ ہر چیز کو قبول کر لیا ان کی بیوی

کو..... ان کے بیٹے کو اس کا یقین تھا کہ جب وہ اس سے

اتنی محبت کرتے ہیں تو وہ خود کیوں پیچھے رہے؟ مگر بس یوں

ہوا کہ جب وہ گھر جاتے..... اس کی راتیں خوفناک خواب

میں ڈھل جاتیں۔ وہ دوائیوں کا ذخیرہ اندر رکھتی..... مگر نیند

آنکھوں کے پاس نہ پہنچتی۔ کچن میں کام کرتے ہوئے بار

بار چھری سے ہاتھوں پہ کٹ لگتے..... وہ ضبط کر کے بہتا

خون دیکھتی رہتی..... کوئی کتاب لے کر نہ لگتی تو لفظ غائب

ہو جاتے۔ وہ ساری رات جاگتی رہتی۔ یہ احساس کس قدر

کریماک تھا کہ وہ کسی اور کے پہلو میں تھے۔ وہ ہونٹ

اور یہ محبت کی انتہا کے دن تھے۔ وہ دونوں اپنے سوا ساری دنیا کو بھول چکے تھے۔ پھر نیا سال آیا وہ دیر تک جاگتے رہے اور ایک دوسرے کی سانسیں سنتے سنتے سو گئے فون کال چلتی رہی۔

اس نے انہیں پہلا تحفہ بھیجا تھا۔ بہت خوبصورت شرٹ اور ٹائی۔ وہ بے انتہا خوش ہوئے تھے۔ اس نے لن کو اپنی خوبصورت ہینڈ رائٹنگ میں خط لکھا تھا۔ وہ بے حد خوش تھے۔ اور انہوں نے بہت لاڈ سے پوچھا تھا کہ اسے کیا چاہیے وہ اسے کیا بھیجیں جو بلا اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”کچھ نہیں آپ ہیں نا میرے پاس مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“ اس نے محبت سے چور کچھ میں کہا اور وہ فخر سے ہنس پڑے تھے۔ اور اس شام انہوں نے اس کی دی ہوئی شرٹ اور ٹائی لگا کر جو تصویر بنائی اور ملا کو بھیجی تھی وہ کتنی دیر اسے گم صدمہ دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے سرخیل پر رکھ دیا اور آٹو قطرہ قطرہ بہنے لگے۔

اے عشق ہمیں برداشت کر

پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم

تو اور ہمیں ناشاد نہ کر

قسمت کا ستم ہی کم نہیں کچھ

بیزارہ ستم ایسا دیکھ

جتا نہیں یہ کیسی محبت تھی نا پتہ نہیں یہ کیسا عشق تھا؟ وہ ہر لمحہ خود کو پکھلتا اور گم ہوتا محسوس کرتی تھی۔ اس عشق نے اسے فنا کر دیا تھا۔ اسے صرف یہ یاد رہا تھا کہ آغا شاہ زمان اس دنیا کا وہ واحد انسان تھا جو اس سے محبت کرتا تھا وہ واحد ڈی ٹکس جس نے اس کو ماہ ہونے کا احساس دلایا تھا۔ جس کی بند مٹھیوں میں جگنو اس کی راہ کی روشنی تھے۔ اسے اس کے سوا کچھ دکھائی دیتا تھا نہ سنائی وہ عشق کے خمار میں گم اپنے دن رات اس کے نام کر چکی تھی۔ بلکہ اپنا آپ قربان کر چکی تھی۔

اس نے لرزتی آنکھوں سے اہل سی ڈی کی اسکرین کو چھوا جہاں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ سما گن تھا۔ اور اس کے اندر بڑی شدت کی بے تابی جاگی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہ چہرہ

قرب سے دیکھے بہت پاس سے لن کی مسکراہٹ دیکھے جس کی وہ ہوا پانی تھی کہ جب یہ چہرہ اس کو دیکھ کر مسکرائے گا تو کیسا لگے گا؟ اور جب یہ آنکھیں جن کی چمک سے اسے اپنی زندگی روشن لگتی تھی۔ ہاں یہی آنکھیں جب اس کے پاس ہوں گی تب کیا ہوگا؟ اور ان کے گلابی نرم لب..... جنہیں دیکھ کر شدت سے اسے گلابی رنگ کے سد بہار کے پھول یاد آتے تھے یہ لب کس طرح کھلتے ہوں گے؟ جب وہ اسے میری جان ماہا کہ کر پکاریں گے۔

وہ اپنی خواہش کی شدت سے نڈھال ہو گئی اتنا کہ اسے لگا اگر اس نے آغا کو اپنے پاس اپنے سامنے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تو شاید وہ مر جی نہ سکے گی اس نے اپنی خواہش کا اظہار آغا سے کر دیا رہائی نہ گیا تھا۔ وہ تو خند بہتا ہوا تھا فوراً ہی بول اٹھے۔

”میں تو خود کب سے مر رہا ہوں..... ماہا..... میں بھی تو مرنے چاہتا تھا۔ میں ضرور آؤں گا فی الوقت یہاں کچھ ٹیوشن ہیں آفس میں ہو سکتا ہے میں ٹریننگ پہ چلا جاؤں۔“ انہوں نے اپنی مجبوری بتائی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا دن گزرتے گئے وہ انتظار کرتی رہ گئی اور وہ ٹریننگ پہ چلے گئے ماہا کی تو جان سولی پہ اٹک گئی کہاں وہ دونوں دن میں تین تین گھنٹے بات کرتے تھے کہاں وہ اتنے مصروف ہو گئے کہ بمشکل دس منٹ نکال پاتے روم کسی کو لیک کے ساتھ شیئر کرنے کی وجہ سے وہ رات کو بھی بات کرنے سے قاصر تھے۔ وہ پاگلوں کی طرح سارا سارا دن فون سامنے رکھ کر بھی انتظار کرتی رہتی..... اور ساری رات تڑپتی راتی انتظار کی سولی اور روح میں پڑتے شکاف اسے نڈھال کیے دے رہے تھے۔ چھٹی کا دن آیا تو ساتھ پارٹ بھی لایا تھا۔ ان کی کال آئی تو ماہا کی آنکھیں برسنے لگیں۔

”میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی آغا..... مجھے اپنے پاس لے جائیں۔“ اس نے اتنی کرب ناک آواز میں مدد سے ہوئے احتجاج کی تھی کہ انہیں لگا ان کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ کہاں یہ گوارہ کر سکتے تھے؟ وہ بھی تو یہی چاہتے تھے۔

اسے بھیجیں تو فخر سے ماہا کا سرو نہ اٹھایا ہو گیا تھا کیونکہ آخراں کی کامیابی میں کہیں نہ کہیں اس کا بھی تو ہاتھ تھا۔ اس رات انہوں نے کئی مہینوں بعد رات دیر تک بات کی تھی۔

"میری دعا ہے خدا آپ کو اس سے بھی زیادہ کامیابیاں دے اور ہمیشہ آپ کو اپنے رفیقوں میں سر بلند رکھے۔" اس نے تو نجانے کب سے اپنی سب دعا میں ان کے نام کر دی تھیں۔

جنہاں اب سے بھی پہلے قبول ہو جائے یہی دعا ہے میری تیری ہر دعا کے لیے! اس نے آنکھیں موندتے ہوئے جذب سے کہا تھا۔

مگر سب کچھ بدل چکا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ پچھان گزرنے کے بعد اس پر ایک اور پہاڑ ٹوٹا۔ وہاں کے ان کی پہاڑوں کو زوہاں آ رہی تھیں چونکہ وہاں کی کال کال نہیں تھا اس لیے وہ ان کے پاس پہنچنے کے لیے اس سے آئی تھیں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہاں کی حالت بری تھی کہ اب وہ میلے کی طرح تھیں۔ انہیں کہیں گئے بات تو ضرور ہوگی مگر تم کم..... وہ

پچھان سے پھوٹ کر رو رہی۔ کیا تم اسے بھول گئے وہ جس نے تمہارے خوابوں میں آنکھیں اور تمہارے داستانوں میں پاؤں ڈھکی کر لیے جس نے اپنے سارے سننے اور تمنا میں صرف ایک تم تک محدود کر لیں اور صبح شام دو پہر

اپنے تمام وقت صرف تمہارے لیے اپنی چھیلی ہوئی تسلیوں پہ لیے پھر!! زندگی کیا تھی صرف ایک اس کی فون کال تک ہی زندگی تھی کیا؟ اس نے کس کس طرح اپنی کمپرٹ زون سے باہر جا کر اس شخص کو سہولتیں دی تھیں وہ شخص قطعاً بے خبر تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اسے بتائے اس نے بھی گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے اس سے بات کی تھی۔

"میں بہت مسائل کا شکار ہوں ماہا..... آئی آر پی بنی ہے جس کے لیے نہ میرے پاس نامم ہے نہ انرجی..... ٹریفنگ کا شید دل اتنا سخت ہے کہ بہت دفعہ کھانا کھانے کا وقت بھی نہیں مل پاتا یہ ٹریفنگ ختم ہو تو کچھ کروں گا۔" ان کے بچے میں ٹھکن تھی۔

"میں بنا دیتی ہوں آپ کی آئی آر پی؟" اس نے کہا۔

"ارے....." وہ ہنس پڑے۔ "پتا بھی ہے آئی آر پی کس کو کہتے ہیں؟"

"Indivisual" ریسرچ پیپر۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ وہ بے ساختہ متاثر ہوئے تھے۔

"آپ کو لگا تھا مجھے نہیں پتا اب اس کی بھی بات نہیں ہے آغا میں اتنی نالائق نہیں ہوں آپ بس مجھے ہدایتیں۔ میں بناؤں گی آپ کی آئی آر پی اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو ضرور پسند آئے گی۔" وہ ضد کر رہی تھی۔

"میری جان تم اپنے ایگزاحر کی تیاری کرو۔" اور بہت ریسرچ ورک ہے بہت سخت مشقت والا کام ہے میں کروں گا اور پھر تمہیں تو کوئی تجربہ بھی نہیں تم کیسے کرو گی؟ میں کہہ رہا ہوں نا۔ رہنے دو۔ میں رات میں کام کر لیا کروں گا۔" وہ اسے پیار سے منع کر رہے تھے مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کس قدر تھکے ہوئے تھے جبکہ وہ تو سارا وقت گھر کا یہاں تھی اس نے ضد کر کے ان سے ناپک لے لیا۔ پھر جتن گئی اس کام پر۔ اب یوں ہوا کہ وہ دن بھر ٹریفنگ کر رہی تھیں ماہا اپنی پڑھائی میں اور ان کی ریسرچ کرنے میں مصروف ہوئی دن گزرتے گئے اور ان گزرتے دنوں نے ان کی آپس کی کشش کو مزید بڑھا دیا تھا۔

چار ماہ دن دن کی ٹریفنگ کے بعد جب انہوں نے اپنی آئی آر پی جمع کرائی تو وہ سیکرٹریٹ گروپ کے تمام آفیسرز کے ریسرچ ورک میں سے شاندار اور بے مثال تھا۔

"ماہا سلطان" کا کچھ مزید قرض چڑھ گیا تھا ان کے اوپر۔

اس شام پانچ آؤٹ فنکشن میں آغانے اس کی شرٹ پہنی تھی اور جب انہوں نے اپنی فنکشن کی تصاویر

بتانا۔ "وہ زہر زہر الفاظ اس کو سناتی باہر چلی گئیں۔ اور وہ گھٹنوں کے مل زمین پر گری روئی رہی۔"

"آغا..... ایسے نہیں ہیں! وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ مجھے ضرور اپنا بنا کر لے جائیں گے! وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ پروا کرتے ہیں میری میرے احساسات و جذبات کی! وہ ایسے نہیں ہیں۔" وہ بڑبڑاتی رہی۔

اور جب اسی وقت ان کا فون آیا تو ملہا کو روٹے دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ انہوں نے بہت اصرار کر کے جاننے کی کوشش کی تھی کہ وہ اسے معاملہ بتائیں مگر وہ کچھ بھی بولے بنا بس روئی رہی اور یہی کہتی رہی کہ وہ اسے چھوڑیں گے تو نہیں؟ انہوں نے اسے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اسے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔

"میں تمہیں اپنے آؤں گا ماہا ہر صورت۔" وہ اسے یقین دلانے لگا۔ "میں تمہیں رہے تھے اور ان کی محبت نے وہ سارا زہر جو میں لیا تھا جو ماہا اس پر اندر ل کر گئی تھیں۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ ان کے لیے کھلونا نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اسے استعمال کر رہے تھے۔ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنائیں گے! اسے اپنے گھر کی ملکہ بنائیں گے اور تب وہ ماہا کو غلط ثابت کر دے گی۔"

ہاں وہ کس قدر بے خبر تھے کہ وہ اپنے گھر میں کیا کچھ فیس کر رہی تھی؟ وہ سسک سسک جاتی! وہ اس سے دور ہو رہے تھے کیونکہ اب ان کی بات بہت کم ہوتی تھی ان کی کزنز ساتھ رہتی تھیں وہ کسی انکوائری کے تحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ سخت فرسٹریشن کا شکار رہنے لگی۔ ہر وقت کی بیٹ تیز اور ہلکی بی بی..... دوائیوں کا ڈھیر کھا کر بھی اسے سکون نصیب نہ ہوتا وہ روئی تو وہ چڑ جاتے۔

"کیوں روئی ہو ماہا؟ اپنی حیثیت سے براہ کر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ زچ آ کر کہتے۔

"میں بھی تو اپنا بیٹ دے رہی ہوں۔ میں نے کہاں کی کی ہے۔" وہ بھی تڑپ کر پوچھتی تو وہ خاموش ہو جاتے۔

"آپ کب آئیں گے آغا۔"

وہ کیسے بھول سکتی تھی وہ دن؟ جب ماما نے اس کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اس کی باتیں سن لی تھیں۔ گھر میں ایک طوفان آیا تھا۔

"کون ہے وہ جس سے تم بات کرتی ہو؟ کس کو رو کر دکھا رہی تھیں؟ ایسے کون سے دکھ لگ گئے ہیں تمہیں جو تم کسی غیر مرد کے آگے رو رہی تھیں کون ہے یہ آغا؟" ماما نے حلق کے مل چلاتے ہوئے اس کے گال پہ پھینچ مارا تھا۔

"ہیسا کچھ نہیں ہے ماما آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ روئی ہوئی ٹوٹی پھوٹی سی وضاحت کر رہی تھی۔ فضا نے یہ سب سنا اور چکے سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس نے اپنی فیس بک آئی ڈی لگا لی جانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس نے آغا کا نام سنا ہوا تھا اور جلد ہی اسے مطلوبہ انفارمیشن مل گئی۔

رات اس نے ملہا کو تفصیل بتائی تھی فیس بک پہ کسی بھی شخص کو ڈھونڈنا قطعاً کوئی مسئلہ تھا۔ اور آغا شاہ زمان تو اس صورت میں اسے جلد ہی ڈھونڈ لیا کہ وہ ماہا کا مشہور دوست نکلا۔ اس نے اس کی ٹوٹل پروفائل چیک کی اور ماہا کو ساری رپورٹ دے دی اور اگلی صبح اس کے لیے ایک تقرار شادیار کھڑا تھا۔

"پوری دنیا میں تمہیں وہی ماما کہہ رہا ہے۔ بچے کا باپ؟ جانتی کتنا ہوتی ہے؟ یہی نہیں ہے تو تم کس قدر غلط اور گھٹیا ہوئی ہے تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ بے رحم ہوتے ہیں یہ جذبات و احساسات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ان کے اندر....." ماما گلے کی رگیں پھلا پھلا کر بول رہی تھیں۔ اور اس کا ہر ہر مسامہ ان کی رائے کے خلاف تھا۔ وہ انہیں غلط کہنا چاہتی تھی اس کے اندر بڑے غضب کی مزاحمت تھی تھی مگر انہوں نے بولنے کا موقع ہی کب دیا تھا۔

"مرزا اس کائنات کی سب سے بدتر مخلوق ہے ماہا..... یہ ہمیشہ چور دروازہ کھٹار رکھتے ہیں کسی کے گھر کی ملکہ بننے کی بجائے تم اس کا چور دروازہ بن گئی ماہا..... جانتی کتنا ہوتی مردوں کو..... وہ شخص تمہیں استعمال کر رہا ہے..... نشوونما کی طرح وہ جس دن تمہیں لینے آئے گا تا تب مجھے ضرور

"بہت جلد۔"

"اگر میں آ جاؤں تو؟"

"تم پاگل ہو؟"

"نہیں بتائیں نا..... اگر میں آ جاؤں تو آپ مجھے

پہچاننے سے انکار کر دیں گے؟"

"پاگل مت بنو ایسا کوئی قدم مت اٹھانا۔"

"کیوں کیا ساتھ میں ایک کپ چائے بھی نہیں

پیش گئے؟"

اس بار وہ چند لمحوں پہلے چپ رہے۔ اس پاگل لڑکی کے

لبھ میں جتنی بھی اس نے انہیں چپ لگادی تھی۔

"صرف چائے کیوں؟ کھانا کھلاؤں گا وہ بھی

اپنے ہاتھوں سے۔" انہوں نے صدق دل سے کہا۔

وہ کھل اٹھی۔

"ہم اہل جنون لوگ ہیں سرکار..... ایسا نہ کریں

ہمارے ساتھ ورنہ یوں نہ ہو کہی دن دروازے پر دستک ہو

اور ہم آ جائیں۔" وہ شوخی سے بولی۔

جواباً وہ ہنس دیئے تھے۔



اور پھر اس کے سی ایس ایس کے ہیچر آ گئے۔ آ غانے

ہر قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ وہ ان سے بات کر کے جاتی اور

ہیچر دے کر آنے کے بعد سب سے پہلے انہیں ہال میں لے جاتی

پاپا تو اس سارے قصبے سے لاعلم تھے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ شاید

اپنی کسی دوست یا بچہ میٹ سے ڈسکس کر لی ہے۔ بارہ

ہیچر ز یوں ہوئے کہ پتا بھی نہ چلا۔ اور بس اس کے بعد وہ

گھر میں بالکل فارغ تھی۔ اب اس کا سارا دھیان آ غا کی

سمت لگ گیا۔

اور دراصل یہیں سے اس کا زوال شروع ہوا تھا۔

پاپا کے کسی دوست کے بیٹے کا پر پوزل آیا تھا۔ ماما تو

رضامند تھیں مگر اس نے دے دے بے لفظوں میں انکار

کر دیا۔ پاپا نے بلا کر وجہ پوچھی تو اس نے سی ایس ایس

کی آ ز لے لی۔ ماما خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

انہیں سب سمجھا رہی تھی مگر وہ پاپا کے سامنے یہ راز فاش

کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

"مجھے سی ایس ایس مکمل کر لینے دیں پاپا۔ اس کے بعد

آپ جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔" اس نے

درخواست کی تھی۔

پاپا نے بلا روکد مان لی۔ اور وہ رات چاہنے کے

باوجود آ غا سے یہ بات چھپا نہیں سکی تھی۔ انہیں جیسے کرٹ

لگا تھا۔

"آ غا! میں کب تک اپنا دفاع کر سکوں گی؟ مجھے آپ

کی ضرورت ہے۔ پلیز اب تو آ جائیں۔" وہ التجائیہ انداز

میں کہتی رہ پڑی۔

"تم اپنا سی ایس ایس کر لو میں تم سے شادی کر لوں گا۔"

انہوں نے شرط لگا دی۔ ماما تنگ سی رہ گئی۔

"کیا مطلب؟ آپ مجھے مجھ سے شادی نہیں

کر سکتے؟" وہ پتک کر پوچھ رہی تھی۔

"اس میں شک ہے۔ بہتری ہے۔ تمہاری پوسٹنگ

ہو جائے گی تو تمہارا پاس اتھارٹی ہوگی۔ تم مجھ پہ

فیس بک نہ لکھ رہی ہو۔ جی کہہ رہا ہوں یہ بہت ضروری

ہے۔" انہوں نے نکل سے سمجھایا۔

اور اگر میرا سی ایس ایس نہ ہوتا تو.....؟" اس نے

عجب سے انداز میں کہا۔

"مجھے پورا یقین ہے تم پر۔" وہ فخر سے بولے تو ماما سوچ

میں پڑ گئی تھی۔ پتا نہیں تقدیر میں کیا لکھا تھا فی الوقت تو

اس کی قسمت میں بس انتظار ہی رہ گیا تھا۔

اس کا برتھ ڈے آیا تو آ غا نے اسے ایک بہت حیران

کن سر پرانز دیا تھا انہوں نے اس کے لیے سفید رنگ کا

ایک بہت خوبصورت سندھی اسٹائل کا لباس بھیجا تھا اور

ساتھ ڈھیر سارے پھول۔ وہ جیسے ساتویں آسمان پہ جا

چلی تھی۔ حالانکہ اس نے سفید رنگ کبھی نہیں پہنا تھا۔ مگر

جب انہوں نے بھیجا تو گویا اس پر فرض ہو گیا تھا پہننا.....

انہوں نے اس کو پکی برتھ ڈے سوٹنگ گا کروٹ کیا تھا اس

کو بہت سے دعا سہیہ بیچا مات بھیجے تھے اور وہ بے ساختہ

ہنس پڑتی اسے نہیں پتا تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ کیا چال

ہل رہی تھی۔

کرنے لگا وہ درد سے کراہتی رہی ماما آئیں تو اس کی حالت دیکھ کر وہل سی گئیں۔

”کیا کر لیا ہے تم نے خود کو؟ کیا ہوا ہے؟“ وہ گھبرا کر بولیں۔

وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں کرا رہی تھی۔ ماما نے فوراً پاپا کو بلایا انہوں نے ڈاکٹر کو کال کی۔ ڈاکٹر آیا چیک اپ ہوا اور ایک نئی پریشانی تیار تھی۔

”یہ بازو کا درد ٹھیک نہیں یہ انجائنا کا Symptom ہے اور کل کو ہارٹ ایکٹ کا بھی سبب بن سکتا ہے۔ انہیں کہیں یہ خود کو ریلیکس رکھیں اور خوش رہنے کی کوشش کریں۔ یہ شدید اسٹریس لینے کا نتیجہ ہے اور اس کے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوں گے۔“ ڈاکٹر نے تفصیل سے انہیں بتایا تھا اور ساتھ ہی دوائیوں و لائسنس کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں خاموشی سے سنتے رہے پاپا دوائیاں لے کر آئے تھے رات گئے جب انہوں نے ملا کو بلایا تو ان کے چہرے پر عجیب سی سرد مہری تھی۔

”کیا بات ہے..... ماما کو کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے گھبراہٹ سے پوچھا۔

”مجھے تو خود نہیں پتہ۔“ وہ گھبرا کر وضاحت دینے لگیں۔

”کیوں..... کس قدر لاعلم عورت ہو تم۔ تم میں ہو اس کی؟ تمہیں خبر ہوئی چاہیے کہ خرابی کون سی بات ہے جس نے اسے اس حال تک پہنچا دیا ہے؟ انہوں نے دو ٹوک کہا۔

”سلطان! میری بات کا یقین.....“ انہوں نے وضاحت دینی چاہی۔

”مجھے بے خوف مت بناؤ ساحرہ! میں بچہ نہیں ہوں آخر ایسی کون سی بات ہے جس نے میری بیٹی کو یوں پریشاں کر دیا ہے؟ یہ سچہ زکا کا حال تو قطعاً نہیں ہے۔“

”اس لیے کہ یہ پریشانی میں نے اس کے امتحان کے دوران کبھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھی گھر میں بھی کوئی بات نہیں ہوئی تو پھر آخر ایسی کون سی بات ہو گئی ہے جس

حکومت بدلی تھی اور اس کے نتیجے میں پورے ملک میں یورو کرسکی میں بھی شدید انتظامی اکھاڑ پھانڈ جاری تھی۔ اس کی زد میں آغا کا محکمہ بھی آ گیا تھا۔ آفیسرز کے فون ریکارڈ کیے جا رہے تھے جبکہ سرکاری دفاتر تو آل ریڈی بجھتے ہوئے تھے انہوں نے اسے فیس بک پر میسج کر کے یہ سب کچھ بتایا تھا اور اسے کال کرنے سے سختی سے منع کیا تھا۔

اس دن وہ سارا وقت جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگتی رہی کہ ان کا جو بھی مسئلہ تھا وہ فوراً حل ہو جائے۔ وہ ان سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔

موسم بھی بارشوں کا تھا۔ ایسے میں رک رک کے ہلکتا اس کا دل وہ اس معمول کی عادی ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ اسے لگتا جب تک وہ صبح ان کی آواز نہ سن لے گی اس کی صبح ہی نہ ہوگی نہ ہی سورج اس کی کھڑکی پر اپنی کرنیں پھیلائے گا۔ وہ جاگ کر بھی لیٹی رہتی اور نیم غنودگی میں بھی ذرا دیکھتی رہتی۔ اس کو انتظار ہی رہتا اور اس کا دل ہلکا ہوتا۔ اس انتظار نے اسے اندر سے توڑ دیا تھا۔ وہ قہر و غم سے رکتی رہتی تھی۔

اس نے فیس بک پر انہیں میسج کیا تھا۔
”آپ کہاں کم ہیں آغا؟ تم سن سکتے ہو۔ کب ختم ہوگا یہ سب؟ میں اس سچویشن کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔“ اس کے ساتھ رونے والی آئی کون لگے تھے انہوں نے جب جواب لکھا تو از حد غصے میں تھے۔

”کوہر میں ایک Mess میں پھنسا ہوا ہوں اور تمہیں اپنی نازک مزاجی کی پڑی ہوئی ہے تم مت کروٹیکسٹ۔ اور نہ ہی انتظار۔“

وہ شاکہ رہ گئی تھی۔ اسے اپنے درمیان پہلی مرتبہ ایک بہت بڑی دراڑ نظر آ رہی تھی۔ وہ اسے اس قدر غلط سمجھ رہے تھے اسے بے تحاشا دکھ ہوا تھا اور جب رات گئے تک ان کا کوئی ٹیکسٹ نہ آیا تو اس کا باپاں بازو درد

دیتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ وہ ابھی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ جیسے ان کی بات کی گہرائی سمجھنے سے قاصر تھی مگر ان کے اس طرح پیار کرنے پہ اس کے اندر ایک سکون اتر اٹھا۔ وہ کبھی بچپن میں اسے اس طرح پیار کیا کرتے تھے۔

”ایک آسمان پر اڑنے والے پرندے کو اگر پانی میں رہنے والی ایک مچھلی سے پیار ہو جائے تو وہ کیا کریں گے؟“ کچھ بھی نہیں پرندہ پانی میں رہے گا تو مر جائے گا اور مچھلی پانی سے باہر آئے گی تو تڑپ تڑپ کر جان دے دے گی۔ وہ مل نہیں سکتے مل کر کہیں رہ نہیں سکتے اور جب ان کا ملاپ ممکن نہیں ہو پاتا تو وہ واپس اپنی اپنی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح ایک شخص وقتی دل بہلانے کے لیے کہیں سر جھکا دیتے ہیں جانتے ہیں کہ اسے رہائش کے لیے کسی ایسے گھر میں قیام کرنا پڑتا ہے وہ وقتی طور پر وہاں ٹھہر رہے ہیں۔ وہ واپس اپنے وطن جانا ہوتا ہے وہ وہیں ٹھہر کر رہ سکتا ہے اسے اپنے آپ کو رہائش کرنے کے لیے اسے وہ سب اچھا لگتا ہے مگر کب تک؟ آخر کار اسے اپنے گھر اور اپنا گھر یا دانا لگتا ہے اور وہ واپس جانے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے تمہارے بارے میں بہت بلند اور خوشنما خواب دیکھے ہیں۔ میں نے تمہیں ہمیشہ بہت مضبوط دیکھا ہے میرا کوئی بیٹا نہیں ہے مگر میں نے تمہیں ہی اپنا بیٹا سمجھا ہے اس لیے مجھے کبھی ایسا نہیں لگا کہ میں اکیلا بڑ جاؤں گا۔ اور میری شہزادی بابا! اپنے آپ کو شہزادی بناؤ۔ تمہیں پتا ہے شہزادیاں اپنے وقار میں رہتی ہیں۔ اپنے وقار سے بچے نہیں آتیں۔ خود کو دولت کی دلدل میں مت گراؤ۔ تمہیں چڑیا بننا ہے جو گھر بساتی ہے گھونسلہ سنوارتی ہے سناپ نہیں جو کسی کے بچے کھا جاتا ہے۔ میں تمہیں وہ مچھلی بھی نہیں بتے دیکھ سکتا جو تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی ہے اور نہ ہی تم وہ ریست ہاؤس ہو جسے کوئی اپنی وقتی تسکین کے لیے استعمال کرنے کے بعد ویران کر کے

نے اسے انجانا تک پہنچا دیا ہے۔ بولو سارو۔“ وہ گرج رہے تھے۔ بابا! تم صدمی ہو گئیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ایسا واقعی نہیں ہے۔“ انہوں نے اتفاق کیا۔

”یہ تصدیقی بیان مت جاری کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ کیا وہ کہیں انوار ہے؟“ انہوں نے اس بار پیچھے ہٹنے لگے میں پوچھا۔

بابا کا رنگ اڑ گیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے انک کر کہا۔ بابا نے خاموشی سے ان کا چہرہ جانچا اور پھر بلند آواز میں فضا کو آواز دی۔

فضا اندر آئی تو انہوں نے تند و تیز لہجے میں اس سے بھی وہی سوال کیا۔ فضا کے تاثرات سے انہیں مزید کھٹک لگ گئی۔ انہوں نے مزید سختی سے باز پرس کی تو وہ ڈر گئی۔ اس نے باپ کا کب ایسا لہجہ دیکھا تھا؟ اس نے ہم کر سارا جگ بتا دیا۔ بابا کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے فتنہ رگھت کے ساتھ فضا کی ساری بات سنی تھی کیا کہہ رہی تھی وہ؟ کہ ان کی بیٹی کسی شخص سے انوار تھی؟ اور وہ شخص تھا بھی کون؟ ایک شادی شدہ۔ ایک بچے کا باپ۔

جیسے ماتم کناں تھے۔ انہوں نے اس کے بعد اگلے چار دن کچھ نہ کھایا تھا اور کمرے میں خود کو بند کر رکھا۔ کچھ دن جھولتے ہوئے انہوں نے وہ سب سنا دیا۔ انہوں نے اپنی کوشش کی تھی جس کی سزا میں ان کا منہ بہ منبہ رہی تھی اور اگلے دن وہ اس کے کمرے میں گئے تھے۔ اس کا سر دباتے رہے تھے اور پھر جب وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر منع کرنے لگی تو انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا وہ اس سے بات کرنے آئے ہیں۔

”بابا! تم میری بیٹی نہیں۔“ بیٹا ہو۔ میں نے تمہیں کبھی کسی کام سے نہیں روکا۔ ہمیشہ تمہیں ہر طرح کی آزادی دی۔ تمہیں پتا ہے سناپ جب کسی چڑیا کے گھونسلے میں تھس کر اس کے بچوں کو کھا لیتا ہے تو دنیا سے کیا کہتی ہے؟ دنیا اسے غاصب کہتی ہے اور سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔“ وہ پیار سے اس کے ماتھے پہ ہوس

شاک لگا تھا۔

"ماہ تم..." وہ بے ساختہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
 "تم نے کیوں کی آفس کے نمبر پر کال۔" طیش سے
 ان کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔" اس نے
 کمزوری وضاحت دینے کی کوشش کی تھی۔

"ضروری بات؟ کون سی ضروری بات؟ تمہیں اندازہ
 ہے تم نے کیا کیا ہے؟ کیوں کیا تم نے آفس کے نمبر پر
 فون؟ تمہیں پتہ ہے کہ کس قدر حساس معاملہ ہے اور تم

نے..... تم سے ذرا صبر نہیں ہوا۔ کیوں تم میرا تماشہ بنوانا
 چاہتی ہو مجھے کیوں برباد کرنا چاہتی ہو؟ اگر کوئی بھی

انکوائری شروع ہوئی تو میں کیا کہوں گا کون ہو تم؟ تمہیں
 قہر احساس نہیں ہے۔ وہ بھڑک کر بول رہے تھے واز میں

نرمی ناسی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ شاک نہ تھی۔ یہ کون تھے؟ ان
 آغا کیلئے وہ جان لیوا نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ

سست تھے نور وہ بے خبر تھی۔
 دوبارہ اس نمبر پر کال مت کرنا۔ ورنہ مجھے مجبوراً تمہارا

نمبر بلا کر کروانا پڑے گا۔" انہوں نے دھمکی نہیں دی تھی
 سچ بتایا تھا وہ یہ بات بھی کر سکتے تھے وہ اس شخص کے اختیارات

سے واقف تھی۔
 اس کے بعد فون کھٹاک سے کریڈل پر پٹخ دیا گیا۔

ماہا کو لگا اس کو بھی آغا نے یونہی اٹھا کر اپنی زندگی سے
 باہر پھینک دیا تھا۔

اس نے سرد ہاتھوں کے ساتھ فون ایک طرف ڈال دیا
 اور پھر ست آنکھیں بنے لگیں۔



اس رات انہوں نے اسے کوئی سچ نہ کیا تھا۔ جبکہ اس
 نے سوچی کے ۳۸ صبح کر دیے تھے مگر دوسری طرف ہنوز

خاموشی تھی۔ اس کا ضبط آخری حد تک جا چکا تھا مگر اس کی
 آنکھیں اب رورو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ بچے نے سوچ چکے

تھے مگر انہیں کوئی خبر نہ تھی۔ بے بسی تھی کہ رگ رگ تو زردی
 تھی۔ اسے یقین آ رہا تھا کہ یہ آغا ہی تھے آخر ایسی بھی کیا

چلا جائے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے مگر میں چاہتا
 ہوں تم سنبھل جاؤ خود سوچو اور دست فیصلہ کرو۔" انہوں

نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل گئے۔ وہ کسی عام
 تنگ نظر اور قدامت پرست سوچ کے حامل ہوتے تو اس پر

زندگی کا دائرہ تنگ کر دیتے اس کا فون چھین کر کہیں آنے
 جانے پر پابندی لگا دیتے مگر انہوں نے اس کے آگے ہر

مثال کھول کر رکھ دی تھی اس کو دلیل سے بات کرنا اچھا لگتا
 تھا اور انہوں نے اسے منطق کے جال میں پھنسا دیا تھا۔

انہیں یقین تھا کہ وہ بہت بہتر فیصلہ کرے گی۔

پڑ گیا بربادیوں سے واسطہ

راکھی سودا گری مہنگی پڑی!

اور ماہا سلطان مر گئی۔ وہ وہیں مر گئی اپنے پاپا کے منہ
 سے وہ سب سن کر وہ زندہ کہاں رہی گی۔ اس کے ہاتھوں

سے اعتبار اور یقین کی چادر پھسل گئی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا
 تھا کہ اب وہ زندگی بھر بھی اپنے باپ سے نظر اٹھا کر

بات نہیں کر سکے گی شاید وہ اس قابل ہی نہ رہی تھی
 آغا سے اس کی بات ہوئے چار دن ہو چکے تھے

پورے دن میں صرف تین ٹیکسٹ آئے اسے ایسا لگ رہا
 تھا ہر چیز اس کے ہاتھوں سے گم ہو چکی تھی۔ وہ کسی قدر

خسارے میں تھی۔ اپنے باپ کی نظر اس کا اپنا اعتبار گنوا
 کر..... اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگا۔

پانچویں دن اس نے تھک ہار کر گھر نہ کرتے ہوئے
 اور کچھ کھڑرتے ہوئے ان کے آفس کال کر دی۔ فون ان

کے ہاتھ لپا نے اٹھا لیا تھا۔ وہ کچھ جھجک سی گئی۔
 "سر آغا سے بات کروا دیں۔" اس نے

آہستہ سے کہا۔
 کچھ دیر بعد اس کی کال کنکٹ کر دی گئی۔

"ہیلو۔" کچھ دیر بعد ان کی مصروف سی آواز لیز
 پیس سے ابھری۔ اس کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ پانچ دنوں

بعد وہ ان کی آواز سن رہی تھی۔
 "میں ماہا....." اس نے بہت جھجک کر کہا۔ انہیں جیسے

خطا کر دی تھی اس نے جس کی انہوں نے اسے اتنی سخت سزا دی تھی۔

اگلے دن اس نے بتا دیا کہ بابا کو سب کچھ بتا چل گیا ہے اور اس کی طبیعت ٹھیک نہیں جیسی وہ مجبور ہو گئی تھی انہیں کال کرنے پر یہ تیج کرنے کی دیر تھی کہ ان کی کال آ گئی۔ اس نے پہلی بل پہ ہی فون اٹھا لیا۔

”کیا ہوا ہے بابا..... تمہاری طبیعت کو؟“ وہ تشویش سے پوچھ رہے تھے۔

جواب اس نے روتے ہوئے سارا سچ بتا دیا تھا۔ وہ دم بخود سن رہے۔

وہ ان کی لمبی خاموشی کے دوران مسلسل روتی رہی پھر بھی وہ نہ بولے۔

”کچھ نہیں کہیں گے؟“ وہ اذیت سے پوچھ رہی تھی۔

”مجھے چھوڑ دو بابا۔“ انہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں گویا بات ختم کر دی تھی بابا کو لگا کسی نے اس کو سو والٹ کا کرنٹ لگا دیا ہو۔

”میں..... مر جاؤں گی..... آغا خدا کے لیے مجھے

مت ماریں..... خدا کے لیے..... میرے ساتھ سب

مت کریں مجھے اور کوئی نہیں اپنا سکتا۔ میرا دل اور کسی کا

نہیں ہو سکتا آپ ہی سب کچھ ہیں میرا دل تو سکتی

ہوں مگر آپ کو چھوڑ نہیں سکتی۔“ وہ ہلک ہلک کر رہ گئی۔

ان کی چپ میں کوئی فرق نہ تھا تھا۔ ہمارا دل رخن

یہاں تک کہ فون بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل

بھی اس دن اس نے سارا دن کچھ نہ کھایا تھا۔ اس کے

ذہن میں جیسے آغا کے الفاظ چپک کر رہ گئے تھے۔ وہ

مردوں کی طرح بیٹھ پہ پڑی رہی کوئی دیکھ بھی جو اسے

چاٹ رہی تھی اور وہ ختم ہو رہی تھی۔



ہاں یہ تو دنیا کے قانون میں شامل ہے کہ جب زوال

شروع ہوتا ہے تو سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور تھکیر پھیر

کھاتی ہے تو ہر چیز الٹ جاتی ہے اور وہ سب اچھے وقتوں

کی باتیں ایک مذاق محسوس ہوتی ہے اور سیدھے کام بھی

بگڑ جاتے ہیں۔

ان دنوں کے درمیان بھی کچھ نہ ٹھیک رہا تھا بلکہ سب کچھ غلط ہو گیا تھا۔ زندگی کی چال بدل گئی تھی۔

آغا کو آج کل سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ ان کے بابا کو

ہارٹ ایک ہوا تھا وہ بے حد پریشان تھے۔ انہیں اپنے بابا

سے بہت پیار تھا انہوں نے کبھی اچھے وقتوں میں بابا کو بتایا

تھا کہ ان کے بابا نے ان پر بہت محنت کی تھی اور انہیں اس

عہدے تک لے کئے تھے میں انہوں نے دن رات ایک

کر دیا تھا۔ قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی تھی۔ آغا اسے

بتاتے تھے کہ انہیں افسری پلیٹ میں رکھی ہوئی نہیں ملی

تھی۔ وہ سیلف میڈ انسان تھے انہوں نے بہت محنت کی

تھی اس مقام تک پہنچنے کے لیے اور اس میں سب سے بڑا

ہاتھ ان کے بابا کا تھا۔ وہ سب کچھ تھی جیسی خاموشی سے

ان کے دل کے گہرے گوشے میں بات کر کے باقی سارا دن

پھر وہی نظارہ ملتی ہوتی تھی۔

وہ بھی گئے۔ اپنے بابا کے پاس گئے تھے۔ اس نے

ان کے دل کے گہرے گوشے میں بات کر کے سب کچھ بتا دیا۔

”میں صرف ان کی طبیعت پوچھنا چاہ رہی تھی۔“ وہ

گڑبڑا کر بولی تھی۔

”وہ ٹھیک ہیں پہلے سے یہاں بہت سے گیسٹ

آ رہے ہیں پلیز ڈسٹرب مت کرنا اب۔“ انہوں نے

روکھے لہجے میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اس کے بازو میں بڑا شدید درد اٹھا تھا اسے ڈاکٹر

کی ہدایت یا آئی جس میں اسے کوئی سخت پریشانی لینے

سے بری طرح بچانے کو کہا گیا تھا۔ وہ نیم جاں سی وہاں

پڑی رہی اس کا سارا وجود پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس

نے کانپتے ہاتھوں سے ٹیبلٹ منہ میں ڈالی اور پانی کا

گلاس منہ سے لگا لیا۔

اگلا دھچکا اسے رات کو لگا جب بابا نے اسے

اٹھائے گی۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ آج وہ گھر جانے سے پہلے اس سے بات کر کے جائیں گے اور جب ان کا فون آیا تو اس نے چپکے سے فون اٹھایا اور چھت پٹا گئی۔ ابتدائی سلام دعا کے بعد اس نے اپنی بات شروع کی تو وہ ٹھنک گئے۔

"یہ ممکن نہیں ہے بابا" انہوں نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا کہ اس پر گویا ہم پھونڈا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ تڑپ گئی۔

"میں اب ایسا کوئی قدم اٹھانے کی کنڈیشن میں نہیں ہوں بلکہ پہلے کی بات اور تھی اب میری فیملی میرے ساتھ ہے۔"

"آپ کی طرح اتنی بڑی بات کہہ سکتے ہیں؟ آغا! میں بابا کا فیصلہ کیسے مان لوں؟ یہ ناممکن ہے اور یہی ساتھ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ میں کون سا ان کے ساتھ رہنے کے لیے آ رہی ہوں۔" وہ پاگلوں کی طرح دھڑکتے رہے۔

"میں اس قسم کا کوئی بھی کام کر کے اپنے کیریئر کے اس اسٹیج پر اسکیڈ لائز نہیں ہو سکتا بابا" مجھے اپنی جاب سے اپنی پوسٹ سے بہت پیار ہے اور سب سے بڑی بات بابا کی ہے میرے بابا ہارٹ واشٹ ہیں میرا ایک غلط فیصلہ انہیں موت کے منہ میں لے جائے گا۔ میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا جس سے انہیں دکھ پہنچے۔" ان کا لہجہ دھوک تھا۔

بابا کو لگا کسی نے اسے گونگا کر دیا ہو۔

"آغا! میں کیسے زندہ رہوں گی؟ میں مرجاؤں گی۔" وہ بے چینی سے کہتی رو پڑی۔

"پلیز بابا مت رو مجھے دکھ ہوتا ہے اور کوئی بھی نہیں مرتا کسی کے بغیر۔" انہوں نے کہا۔

"ہمیں است کہیں آپ ایسا نہ کریں میرے ساتھ۔"

"میں کیا کر رہا ہوں۔ میں تو تمہیں اس نقصان سے بچانا چاہتا ہوں جو تم اپنا کرنے پر تھی ہو تمہارے گھر والے کبھی نہیں مانے گئے فضول کی کوشش کرنے کا فائدہ؟ تم تو بے وقوف ہو میں چاہتا تھا ہمارا تعلق ختم نہ ہو

پاس بلایا تھا۔

"میں نے فہم کو تمہارے لیے پسند کیا ہے" منگنی تمہارا رزلٹ آنے کے بعد ہی رکھی جائے گی۔ میں تمہارا باپ ہوں میرا تعلق تو بنتا ہے کہ میں تمہارے لیے جو بہتر سمجھتا ہوں وہ کر لوں۔" انہوں نے ہموار آواز میں متوازن لہجے میں کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

جبکہ وہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ حالات و واقعات بڑی تیزی سے اس کے خلاف ہو گئے تھے اور وہ ایک منجرے میں بند قیدی کی طرح پھڑپھڑاتی رہ گئی تھی۔

دوسری طرف اگلی بری خبر اسے آغا کے ٹرانسفر کی ملی تھی اور اس بار ان کی فیملی بھی ان کے ساتھ تھی۔

انہیں نئی گاڑی بھی حکومتی تحویل سے ملی تھی وہ خوش تھے کیونکہ اب وہ اپنے اماں بابا کو بھی ساتھ رکھنے والے تھے۔

بابا کے اندر سناٹے اتر آئے۔ اس کا مطلب صاف یہی تھا کہ وہ اس سے بات کرنا بالکل بند کرنے والے تھے۔

ظاہر ہے وہ تب تک ہی بات کر سکتے تھے جب تک وہ تنہا تھے دوسرے جب ان کی فیملی ان کے پاس آ گئی تو انہیں کس چیز کی ضرورت تھی بھلا؟ پھر وہ چاہے بابا ہوں یا کوئی اور.....؟

"ایک منٹ ہوگا آپ کے پاس؟" وہ ہلکے منگوں کی طرح پوچھتی ڈالت سے مری رہی تھی اب۔ اور وہ ایک منٹ کی فون کال بھی یوں امنینڈ کرتے گویا احسان عظیم کر رہے ہوں۔ وہ صرف دور ہی نہیں ہوئے تھے بےزار بھی ہو گئے تھے اور اس چیز کا احساس بابا کو بڑی شدت سے ہوا تھا۔

اس کا ہی ایس ایس کا رزلٹ آنے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ اور اس نے آج سوچا تھا کہ آغا کو بابا کی فہم والی بات بتا دینی چاہیے کیونکہ یہی صحیح وقت تھا۔ وہ اگر خود آجائے تو کتنا چھٹا ہو جائے گا بابا مان جائیں گے اور پھر وہ آغا کی یہ شرط بھی پوری کر دے گی کہ اس کی اپنی جاب ہوگی انہیں دو گھر نہیں چلانے پڑیں گے۔ کیونکہ وہ اپنا بوجھ خود

اس کا ہی ایس ایس کا رزلٹ آنے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ اور اس نے آج سوچا تھا کہ آغا کو بابا کی فہم والی بات بتا دینی چاہیے کیونکہ یہی صحیح وقت تھا۔ وہ اگر خود آجائے تو کتنا چھٹا ہو جائے گا بابا مان جائیں گے اور پھر وہ آغا کی یہ شرط بھی پوری کر دے گی کہ اس کی اپنی جاب ہوگی انہیں دو گھر نہیں چلانے پڑیں گے۔ کیونکہ وہ اپنا بوجھ خود

اس کا ہی ایس ایس کا رزلٹ آنے میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ اور اس نے آج سوچا تھا کہ آغا کو بابا کی فہم والی بات بتا دینی چاہیے کیونکہ یہی صحیح وقت تھا۔ وہ اگر خود آجائے تو کتنا چھٹا ہو جائے گا بابا مان جائیں گے اور پھر وہ آغا کی یہ شرط بھی پوری کر دے گی کہ اس کی اپنی جاب ہوگی انہیں دو گھر نہیں چلانے پڑیں گے۔ کیونکہ وہ اپنا بوجھ خود

خوش ہوں تم تو چاہتی یہ ہو کہ سب مجھ سے بچیں جائے۔
خالی ہاتھ رہ جاؤں میں..... تم..... تم..... ماما سلطان! تم
مجھے بھانسی کے پھندے تک لے کے جانا چاہتی ہو ذلیل
کروا کے۔ وہ ہر خند لکھ میں کہہ رہے تھے۔
ماما جیسے گھٹنوں کے بل گر پڑی۔

”ایسا نہیں سنا آغا میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔
آپ مجھے چھوڑ دیں مگر اس طرح کے الزام مت لگائیں۔
خدا گواہ ہے اس بات کا میں نے ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی
ہے۔ آپ کے لیے صدقہ دیا ہے میں اگلی نہیں رہ سکتی۔
آپ میرے ساتھ اس طرح نہ کریں۔ مجھے یوں ذلیل نہ
کریں آغا میں بے مزد نہیں کرتی۔ آپ مجھ سے عداوت نہیں
رکھنا چاہتے نہ اس بات نہیں کرنا چاہتے نہ کریں ملنا نہیں
چاہتے نہیں مگر میری محبت کی توہین نہ کریں۔ آپ اپنا
خیال رکھیں میں یہیں موجود ہے مگر رہیں میں آپ کو بھی
تھک نہیں دے سکتی۔ اس نے سن ہوتے اعصاب کے
ساتھ ہلکے سے دھچکا دیا۔

”جنت درالک و مدینہ رقی پھر وہ اٹھ گئی اپنے کمرے
میں۔ اس نے الماری کھول لی اس کو گرمی لگ رہی تھی۔
ان کا دل چاہا وہ دیر تک ٹھنڈے پانی سے نہائے اس نے
دیکھا کہ ان کا بھیجا ہوا سفید سوٹ جو کہ اس نے اب تک نہ
پہنا تھا کچھ سوچ کر اس نے وہ سوٹ نکال لیا اور ہاتھ روہ
میں چلی آئی۔ کافی دیر تک وہ نہا کر واپس آئی اس نے خود کو
آئینے میں دیر تک دیکھا پھر اس نے کپڑے اتار کر پھینک
دیا۔ اس نے اپنا آئی ڈی ڈی اے کیٹوریٹ کر دی پھر اس نے سیل
ری سیٹ کیا تھا پھر وہ اٹھی اور وضو کرنے چلی گئی۔ وضو
کرنے کے بعد اس نے دو رکعت نماز حاجت ادا کی اور دعا
میں دیر تک اپنے لیے معافی مانگی تھی۔

”میں کتنی پاگل تھی نا۔ اپنے لیے شر کو مانگتی رہی
وہ روری تھی میں نے اپنے ماں باپ کی نظروں میں اپنا
اعتبار گنوا دیا۔ میں نے اپنی زندگی تباہ کر لی اس شخص
کے لیے اور اس نے مجھے ذلت کی کھانی میں گرا دیا۔
مجھے زندہ نہیں رہنا۔“

میں نے ہمیشہ اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں رکھی تم نے
وعدہ کیا تھا کہ کبھی آفس کے نمبر پہ کال نہیں کرو گی مگر تم
نے اپنا پراس توڑ دیا میرا تماشہ بنایا آفس میں تم نے
کبھی میرے ساتھ کپڑے مانگے نہیں کیا میں نے ہمیشہ ہر
ممکن حد تک کوشش کی کہ ہمارے درمیان مسائل نہ پیدا
ہوں مگر تم مطمئن نہیں ہوئیں۔ میں اب مزید تماشے
افروز نہیں کر سکتا میں اپنے بابا کا اکلوتا بیٹا ہوں میں ان
کی واحد پونجی ہوں اس لیے بھی میں کچھ کرنے کی
پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ الفاظ تھے کہ تیزاب میں بھیگے
ذلت کے تھپڑے جو اس کو جلا کر رکھ کر گئے۔

”میں بے وقوف ہوں..... میں نے غلط کیا سب
کچھ سب الزام میرے سر سب سوال مجھ سے؟ مجھ
سے جان چھڑانے کا یہی طریقہ ملا ہے آپ کو؟“ وہ چیخ
کر پوچھ رہی تھی اس کا بی بی ہائی ہو رہا تھا اور اس کے
گال تپ رہے تھے۔

”اب آپ کو اپنی فیملی یاد آگئی ہے تب یاد نہیں تھی
جب نمبر دیا تھا۔“ وہ چلا رہی تھی۔

”صحیح سوال ہے تمہارا۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ
میری شادی میرے بابا کی مرضی سے ہوئی تھی میری بیوی
پر بھی کبھی نہیں ہے میں اس سے بات نہیں کر سکتا۔
ہماری بانی زبان کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتی تھی
ایک پڑھا لکھا مرد ہوں میرا بھی دس پچاس تھا کہ ایسا
ساتھی ہو جس کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہو گوئی کیا جو مجھے
مکمل کر سکے۔ تم ملیں تو لگاؤ کمی پوری ہوگئی ہو۔ مگر اب
اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی بیوی کو اٹھا کر باہر
پھینک دوں۔ وہ میرے بیٹے کی ماں ہے۔“ انہوں نے
آخر کار آج بچا گل دیا تھا۔

ماما کو لگا اس کی روح چھانی ہوگئی ہو اس کے لفظ
گو نکلے ہو گئے۔

”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے آغا شاہ
زمان اس نے گویا مشکل دینے کی کوشش کی تھی۔

”تم خوش نہیں ہونا کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں

مسکراہٹ۔ اور وہ محبت اور پھر اسے پاپا کے الفاظ یاد آئے اور پھر ماما۔۔۔۔۔!

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔
بھول جائیں تو آج بہتر ہے
سلسلے قرب کے جدائی کے
بچھ چکیں خواہشوں کی قندیلیں
لٹ چکے شہزادوں کے
زندگی سے شکایتیں کسی
اب نہیں ہیں اگر گلے تھے کبھی



یہ ایک خوبصورت گھر کا منظر تھا فی وی لاؤنج میں ایک شاندار سی برساتی کا مالک شخص ایک بچے کے ساتھ بیٹھا تھا فی وی پر مصروف تھا مگر وہ بچہ بار بار اسے اپنی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور کبھی بکھٹ اس کا ہاتھ رک گیا۔ فی وی میں ان کی باتوں کے نتائج کی تفصیلات دکھائی جا رہی تھیں۔

اس نے لایسٹا آواز بڑھادی۔

”یہاں شہزادیاں ہوتی ہیں اور شہزادیاں کبھی اپنے وقار سے نیچے نہیں آ کر تھیں۔“
اور ان کی شہزادی اپنے وقار سے کس قدر گھڑی تھی۔
ف اس شخص کے لیے جس نے اپنے جانا نہ کسی اور کے قابل چھوڑا وہ کیا بن گئی تھی؟ اور کبھی ایک ملکہ سے گھٹ کر صرف ایک بھکا ہوا کدو بن گیا۔
آغا شاہ زمان نے اسے اس کے ہر اس مدار سے کھینچا تھا اپنی کشش سے اور وہ کسی لوبے کی مانند جو مگنیت کی طرف کھینچتا ہے اور جب اس کشش کا دھماکہ ہوتا تو اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر خلا میں بکھر گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ بیڈ پہ لیٹ کے بھی روتی رہی۔۔۔۔۔ اس کے بازو میں شدید درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنی ستار گنوا دی تھی۔ وہ چڑیا بننے کی بجائے سانپ بن گئی تھی جو دوسروں کے گھونسلے میں گھس کر بچے کھا جاتا ہے وہ پھلی بن گئی تھی جس کو اس نے پانی سے باہر نکال دیا تھا اور اب وہ تڑپے جا رہی تھی وہ کیا بنا گیا تھا اسے؟ ریسٹ ہاؤس۔۔۔۔۔ جس میں اس نے تھوڑی دیر رک کر ریلیکس کیا اور پھر اسے یاد آ گیا کہ اس کا گھر بھی تھا۔۔۔۔۔ اور وہ آخر کار پلٹ گیا تھا۔۔۔۔۔ ماما نے بھی ٹھیک کہا تھا۔۔۔۔۔ مرد چور دروازے ڈھونڈتے ہیں وہ بھی اس کا چور دروازہ بن گئی تھی۔ اور کسی کے گھر کی ملکہ بننے کے قابل اسے اس شخص نے قطعاً نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے ماما کو استعمال کیا تھا ماما نے ٹھیک کہا تھا بالکل کسی نشوونما کی طرح۔۔۔۔۔ ہاں اس نے ایسے ہی کیا تھا۔ وہی ایس بی تھا نا آخر کار۔۔۔۔۔ کتنا عجیب کہا تھا ماما نے۔۔۔۔۔ تھا تو آخر ایک مرد

بابا نے کہا تھا

”یہاں شہزادیاں ہوتی ہیں اور شہزادیاں کبھی اپنے وقار سے نیچے نہیں آ کر تھیں۔“
اور ان کی شہزادی اپنے وقار سے کس قدر گھڑی تھی۔
ف اس شخص کے لیے جس نے اپنے جانا نہ کسی اور کے قابل چھوڑا وہ کیا بن گئی تھی؟ اور کبھی ایک ملکہ سے گھٹ کر صرف ایک بھکا ہوا کدو بن گیا۔
آغا شاہ زمان نے اسے اس کے ہر اس مدار سے کھینچا تھا اپنی کشش سے اور وہ کسی لوبے کی مانند جو مگنیت کی طرف کھینچتا ہے اور جب اس کشش کا دھماکہ ہوتا تو اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر خلا میں بکھر گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کا بازو سخت درد کر رہا تھا۔ اور اٹھ کر کوئی دوا لینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اسے ملایا ڈرہی تھیں۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ کئی قطرے اس کے گالوں پہ پھیل گئے۔ اس نے اپنی تیز ہوتی دھڑکن کے ساتھ سانس کھینچا چاہا۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غما کا چہرہ تھا اور ان کی

عمر گزری ہے بہاروں کے سوگ میں امجد۔
میری لحد پہ کھلیں گے جاوداں پھول گلاب کے!
اب اس کا کمرہ دکھایا جا رہا تھا اور اس کے پاپا۔۔۔۔۔ جو کہ پہلے سے بہت بوڑھے دکھائی دے رہے تھے۔

تو انتخاب رنگ میں مصروف اور ادھر!
کوئی تیرے جنون میں سیاہ پوش ہو گیا!
حالت مردوں سے بدتر ہو گئی تھی۔ انہیں خود سے شرم
آ رہی تھی بے حد..... بے حساب انہوں نے کس قدر ظلم کیا
تھا..... وہ کس قدر گھٹیا اور برے انسان تھے انہیں ضمیر کی
عدالت سے کون بری کرے گا اپنے اعمال کا بوجھ دوسروں
پہ اٹانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔

"اور ہر جان دیکھ لے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا
آگے بھیجا؟" (المقرآن)

وہ تو بڑے حساس خوب پروردگار نرم مزاج انسان تھے
اور اب ان کا کردار گھٹ کر ایک بے حس ظالم اور خود غرض
فحش کارہ گم ہوا۔

ہاں..... وہ حساسی طور پر متحرک تھے مگر روحانی
طور پر تباہ ہو چکے تھے۔ ان کا ایمان غلامت کا ڈھیر تھا، جیسی
تو وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ جیسی تو انہی
مذہبیت اور رسالت کی نام پر اس کے ساتھ بات کرتے

تھے۔ کروہ نون سی چیز ہے جو انسان کو سب ہوتے ہوئے
بے جا عبور کرتی ہے کہ وہ چور دروازے اور ناجائز راستے
استعمال کرے؟ وہ چیز صرف اور صرف دماغ کی گندگی اور
اندک کی شیطانیت ہوتی ہے جو جائز حل موجود ہونے کے
باوجود مطمئن نہیں ہوتی۔

انہیں اپنے نام عہدے، خوبصورت شخصیت اور سب
سے بڑھ کر اپنے اللہ سے بے حد شرم آتی تھی۔

وہ میکائی انداز میں اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازہ رو بہ کی
طرف بڑھے تھے۔

اگلی صبح کے اخبار میں ایک کالمی مختصری خبر لگی تھی۔
"سولی سیکریٹ کے سنٹیئر آفسر آغا شاہ زمان نے
خودکشی کر لی۔"



وہ میکائی انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے..... ان کے
دماغ میں آنکھیاں چل رہی تھیں..... ایسا کیسے ہو سکتا تھا
کہ یہ سب ہو گیا اور وہ بے خبر رہے..... وہ اپنے کمرے
میں داخل ہوئے اور دروازہ بند ہو گیا۔

وہ کب سے ایسی چیز پر جھول رہے تھے۔ انہیں
یقین نہیں آ رہا تھا ایسے کیسے ہو سکتا تھا وہ پاگل ہی جنونی سی
لڑکی مرگئی جسے وہ کبھی کہا کرتے تھے کہ اگر وہ اس سے جدا
ہو گئے تو مرنے کیسے مگر سب کچھ چھوڑ کر کسی جنگل میں
جا بیٹیں گے جسے وہ اپنی زندگی کہا کرتے تھے جس کی آواز
سن کر وہ خود میں زندگی اترتی محسوس کرتے تھے جس کے
علم اور جس کی ذہانت کے وہ مداح تھے جسے وہ "جونیئر
فلسفینر" کہا کرتے تھے۔ اور جس کو انہوں نے کہا تھا کہ وہ
اس سے ملے بنا تو شاید مر بھی نہ سکیں گے۔

اور جسے انہوں نے ہی کہا تھا کہ کوئی کسی کے بغیر
نہیں مرنے..... وہ مصوم سی لڑکی جس کو محبت کی راہ پہ
لانے کے بعد انہوں نے اکیلا کر دیا.....؟ وہ لڑکی جو کہا
کرتی تھی کہ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی..... اور وہ
سچ کہتی تھی وہ مر گئی۔

اسے بات ایک نہیں ہوا تھا اسے تو ان کی سب سے
وفائی ماہر گئی تھی۔ وہ قائل تھے اس کے۔ انہیں ہمارے
یاد آئے ان کا کیا قصور تھا؟ وہ اپنے ابا کا انوکھا سہارا
تھے تو ماں بھی تو تھی جبکہ اس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ اگر
انہوں نے یہ پوسٹ محنت سے حاصل کی تھی تو پھل بھی
کھایا تھا جبکہ وہ ساری زندگی محنت کر کے اس کا رزلٹ
دیکھنے کو بھی زندہ نہ رہی تھی۔

وہ تو ہر لحاظ سے محفوظ تھے۔ نہ ان کے گھر میں کسی کو پہ
چلا تھا نہ ان کا کوئی نقصان ہوا تھا خسارے تو اس لڑکی کے
جسے میں آئے تھے۔ پہلے ماں باپ کا اعتبار کھو کر شاید
انہیں کھونے کی وہ اہمیت نہ کر پائی تھی انہیں خاموشی سے
ان ان آزادی دے کر وہ خود مٹی میں جا سولی تھی۔ اس نے
کچھ نہ کہہ کر بھی انہیں وہ شکست دی تھی کہ وہ چھائی ہو گئے
تھے۔ زندہ تھے مگر